# ذوق دہلوی

تنویر احمد علوی

# ذوق دہلوی

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بُدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔

یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ۔ دوسری صدی عیسوی)

(بشکریہ نیشنل میوزیم۔ نئی دلی)

ہندوستانی ادب کے معمار

# ذوق دہلوی

تنویر احمد علوی

ساہتیہ اکادمی

**Zauq Dehlavi** : A monograph by Tanvir Ahmad Alvi on the Urdu poet. Sahitya Akademi, New Delhi (1992)




پہلا ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس:
رویندر بھون، ۳۵۔ فیروز شاہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
سیلس آفس: سواتی، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر:

جیون تارا بلڈنگ۔ چوتھی منزل، ۲۳اے/۴۴ ایکس۔ ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳
۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۴
۳۰۴۔۳۰۵۔ اناسالائی، تینام پیٹھ۔ مدراس ۶۰۰۰۱۸
۱۰۹۔ جے۔ سی روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

ISBN 81-7201-209-8

SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 15-00

مطبوعہ: اے۔ ون آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۲

# فہرست

## ب (شاعری)

# ذوق — (شیخ محمد ابراہیم)

## پیدائش

ذوق تخلص شیخ محمد ابراہیم ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد شیخ محمد رمضان قصبہ شاہ پور تحصیل بڈھانہ ضلع مظفر نگر (یوپی) کے رہنے والے تھے جس کا اس زمانہ میں سرکار سہارنپور سے تعلق تھا (وہیں) سے تلاشِ روزگار میں یہ کسی وقت دہلی آئے ہوں گے۔

دہلی میں شیخ محمد رمضان نواب لطف علی خاں کی محل سرائے میں ملازم میں تھے یہ صاحب نواب رضی خاں وکیل سلطانی کے بھائی تھے کابلی دروازہ میں رہتے تھے جہاں قدیم دہلی کے اور بھی بہت سے شرفا اور رؤسا کے مکانات تھے اب یہ محلہ باقی نہیں رہا ۱۸۵۷ء کے بعد اس کے محلات اور مکانات کو مسمار کر دیا گیا اور اس کی جگہ لال قلعہ اور کشمیری دروازے کے مابین واقع پرانی دلی کے ریلوے اسٹیشن نے لے لی جو اپنے گوداموں پلیٹ فارموں اور ریل کی پٹریوں کے جال کے ساتھ اِدھر سے اُدھر تک پھیلا ہوا ہے۔

## خاندان

ذوق کا خاندان ایک نومسلم کھتری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی نسبت سے اس نومسلم گھرانے کے افراد اپنے نام کے ساتھ "شیخ" لگاتے تھے۔ ذوق کے خاندان سے رشتہ رکھنے والے لوگ اب سے تیس برس پہلے احاطہ تیزاب لاہور میں فروکش تھے ان کا بیان تھا کہ ان کے رشتے دار قصبہ شاہ پور، قصبہ بنت (ضلع مظفر نگر) اور قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں رہتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک موقعہ پر اس کا ذکر کیا ہے کہ ذوق سے خاندانی نسبت

رکھنے والے کچھ اصحاب دہلی میں جرّاحی کا پیشہ کرتے تھے۔

## ذوق کا بچپن

ذوق کی ابتدائی زندگی کے واقعات یا بچپن کے حالات نہیں ملتے۔ مولینا محمد حسین آزاد نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ خود ذوق نے اپنے بچپن کو ان دو شعروں میں یاد کیا ہے۔

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا
ہائے طفلی کھیلنا، کھانا، اچھلنا، کودنا

---

کہاں وہ موسمِ طفلی کہ ہم دامن سواروں ہیں،
لیا کرتے تھے کار توسن رہوار دامن سے

---

بچے آج بھی اسی طرح کھیلتے دوڑتے اور اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے بچپن میں صحت مند بچوں کی طرح کھیل کود کے شوقین رہے ہوں گے۔ ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گڈی اڑانے یا پتنگ لوٹنے کے شوق میں وہ ایکدن املی کے پیڑ پر بھی چڑھے ایک ڈالی کو مضبوط سمجھ کر اس پر پیر رکھا تو وہ ٹوٹ گئی اور وہ نیچے گر پڑے بہت چوٹ لگی۔ جس کے باعث یہ واقعہ ان کو یاد رہ گیا۔ مولینا محمد حسین آزاد کی روایت کے مطابق اُن کو بچپن میں چیچک نکلی تھی اس کے نشان اُن کے چہرے پر باقی تھے اور ان کی گہری سانولی رنگت پر چمکتے تھے اور بھلے لگتے تھے۔ وہ غالباً اپنے ماں باپ کی تنہا اولاد تھے اس لیے کہ ان کے کسی اور بہن بھائی کا کہیں کوئی ذکر نہیں آیا۔

## ابتدائی تعلیم

ذوق نے ممکن ہے کچھ ابتدائی تعلیم گھر پر بھی حاصل کی ہو۔ مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ محمد رمضان کے بارہ میں لکھا ہے کہ تجربے نے ان کو زمانے کے حالات سے ایسا

باخبر کیا تھا کہ ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کا سرمایہ تھیں۔

بہرحال جب وہ پڑھنے کے لائق ہوئے تو انھیں حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں داخل کیا گیا۔ حافظ غلام رسول یوں تو مکتب داری کرتے تھے لیکن اس سے بھی کچھ زیادہ شوق انھیں شعروشاعری سے تھا اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے ہی یہ شعر بھی کہتے تھے۔

یوں بھی اس وقت کی دلّی میں شعروسخن کے چرچے عام تھے۔ عالم وعامی کوئی اس چٹک سے خالی نہ تھا حافظ صاحب سے بھی کچھ نومشق اصلاح لیتے تھے اور محلّہ کے نوجوان طبیعت کے شوق اور دلونکی امنگ میں ان سے کچھ کہلوا کے بھی لیجاتے تھے۔ غرض کہ ان کے یہاں ہر وقت یہی چرچا رہتا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے

## شوق شعرگوئی

شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے تھے نظم وشعر کے پڑھنے میں ایک خاص روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ شعر پڑھتا ہوا پھرا کرتا تھا۔[1]

"حیات ذوق" کے مصنف احمد حسین لاہوری نے لکھا ہے کہ ذوق مزاروں پر جاکر دعائیں مانگا کرتے تھے کہ "الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے"

آخر ایک دن ان کی زبان سے دو شعر ادا ہوئے جن میں سے ایک حمد اور ایک نعت میں تھا، خود تو اس عمر میں اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ اس مہم کو اس طرح شروع کرتے لیکن یہ اتفاق تھا کہ ایسا ہوا اور جب ایسا ہو گیا تو طبیعت کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ انھیں بار بار گنگناتے رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتے اور خوش ہو ہو کر دوسروں کو سناتے۔

اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ذوق کو بہت تھوڑی عمر سے شعر کہنے کا شوق تھا اور وہ خدا سے دعا کرتے تھے کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔

حافظ صاحب کے مکتب میں رہتے ہوئے یا وہاں سے اٹھ جانے کے بعد جب

---

[1] آب حیات : ۴۲۵

ذوؔق باقاعدہ شعر کہنے لگے تو اپنے استاد کے تخلص شوؔق سے ملتا جلتا تخلص ذوؔق اختیار کیا۔ ممکن ہے ذوؔق نے اپنے استاد کے ایما پر اور ان کے مشورے سے یہ تخلص اختیار کیا ہو۔

## مولوی عبدالرزاق کے مدرسہ میں

حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں ذوق کتنے دنوں تک رہے یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہاں سے اٹھنے کے بعد فوری طور پر یا کچھ وقت گزرنے پر مولوی عبدالرزاؔق کے مدرسہ میں داخل ہوئے یہیں اُن کا اور مولوی محمد باقر کا ساتھ ہوا یہیں ان کے بچپن کے ایک دوست میر کاظم حسین بیقرار بھی ان کے ہم سبق رہے جو نواب رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ ذوق کے اس زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاؔد نے لکھا ہے۔

"کیسا مبارک زمانہ ہوگا جب شیخ مرحوم اور میرے والد ہم عمر ہوں گے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہوگی اور ایک استاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔"

---

تعلیم کا یہ سلسلہ ممکن ہے کسی مرحلہ پر رُک بھی گیا ہو اور ذوؔق درسیات کی تکمیل نہ کرسکے ہوں لیکن ان میں طلبِ علم کا شوق برابر بڑھتا رہا اس کی ضرورت علوم شعریہ پر قدرت حاصل کرنے کے لیے بھی پیش آئی ہوگی۔ مفتی صدرالدین آزردؔہ کے تذکرہ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے [۱] انھوں نے لکھا ہے:

ترجمہ: "کہ وہ سخن گوئی میں اپنی صلاحیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔ فنِ شعر پر قدرت حاصل کرنے علوم شعریہ پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے زبان و بیان کے رموز و نکات کو جاننے — صحیح و غلط کے معیاروں کو جانچنے اور سند بہم پہنچانے کے لیے اس نے علوم شعریہ کی تحصیل کی ہے علم صرف و نحو کو سیکھا ہے اور آج کل منطق کے اصول و قواعد کو سیکھنے اور یاد کرنے میں مشغول ہے۔"

---

[۱] ترجمۂ ذوق تذکرہ، مفتی صدرالدین آزردہ

ذوق نے اپنی شعرگوئی کے ابتدائی دور میں، جو قصیدے لکھے ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ رسمی علوم پر انھوں نے اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی ہے اور وہ علمی اصطلاحات کو اپنے یہاں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے کہ عالم نوجوانی میں ایک قصیدہ لکھا تھا جسے ان کی کم عمری اور ابتدائے کار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور اس خیال سے کہ اس پر برملا اعتراضات نہ ہوں شہزادہ ابوظفر ولی عہد بہادر نے اپنے شفقت کے ساتھ اُسے حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجا تھا کہ وہ اس کے صحت و سقم خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کریں۔ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوق کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی تحصیل علمی کو مکمل کریں اور یہ حسن اتفاق تھا کہ اس کا انتظام بھی ہو گیا۔

"علوم کی تکمیل اور کتابوں کی سیر کا شغل واجب ہوا قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو شاہ اودھ کی املاک کے مختار تھے انھیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل کروائیں، مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے وہی ان کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔

اتفاق سے یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ تیزی طبع کا شہرہ ہو گیا تھا راجہ صاحب نے ان سے کہا میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہا کرو۔ چنانچہ نوبت یہ ہوگئی کہ اگر یہ کسی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب کا آدمی انھیں ڈھونڈ کر لاتا نہیں تو ان کا سبق ملتوی رہتا۔[1]"

---

ان بیانات سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق شروع ہی سے بہت ذہین اور تحصیل علمی کے شوقین تھے انھوں نے صرف شعرگوئی میں کمال حاصل کرنے اور شہرت پا جانے کو کافی نہیں سمجھا اپنے ماحول کے علمی اثرات کو بھی قبول کیا اور اپنی معلومات میں اضافے کے لیے وہ برابر مطالعہ کرتے اور سیر کتب سے دلچسپی لیتے رہے۔

جیسے جیسے ان کی ادبی شعور میں اضافہ ہوا وہ اپنے استاد حافظ غلام رسول شوق

---

[1] دیوان ذوق مرتبہ آزاد : ۴

کی اصلاح سے بھی غیر مطمئن ہو گئے۔

## شاہ نصیر کی شاگردی

ذوق کی نوعمری میں، جہاں دہلی کے نوجوانوں میں شعر و شاعری کا شوق عام تھا وہاں بڑے بڑے استادانِ سخن بھی موجود تھے جن کی شاگردی اختیار کرنا شعر کہنے والوں کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ ش، ق کی درستی اور زبان و بیان کی غلطیوں کی اصلاح اسی طرح ممکن تھی۔

جو شاعر جتنا بڑا استاد خیال کیا جاتا تھا۔ اتنا ہی اس کی شاگردی پر، اس کے حلقہ سخن سے وابستہ افراد فخر کرتے تھے شاہ نصیر اس زمانہ کی دہلی کے ایسے ہی بڑے استادانِ فن میں تھے جو قلعۂ معلّٰی کے بہت سے شہزادوں کے استاد تھے علاوہ بریں شہر کے بھی بعض کہنہ مشق شاعر اور اسی... کے ساتھ ابھرتے ہوئے اہل سخن اُن کو اپنی غزل دکھلاتے تھے اس میں میاں کاظم حسین بے قرار بھی شامل تھے جو ذوق کے بچپن کے دوستوں اور ساتھیوں میں تھے۔

انھوں نے اپنی ایک غزل، جس پر شاہ نصیر سے اصلاح لی تھی، ذوق کو دکھلائی مولینا محمد حسین آزاد نے اس کہانی کو بڑے دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے اور لکھا ہے

"میر کاظم حسین اُن کے ہم سبق و ہم سن تھے بے قرار تخلص کرتے تھے حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑاتے تھے ایک دن میر کاظم حسین نے لاکر غزل سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی خوب گرم گرم شعر نکالے ہیں انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے ہیں اُنہیں سے یہ اصلاح لی ہے شیخ مرحوم کو شوق پیدا ہوا اور انہیں کے ساتھ جا کر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔" [1]

شاہ نصیر کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں، ہزاروں تک پہنچتی تھی حافظ غلام رسول شوق

---

[1] آبِ حیات: 451

بھی اُن کے شاگردوں میں تھے۔ غرض ذوقؔ کو شاہ نصیر کی استادانہ شہرت اور شاعرانہ مقبولیت نے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ انہیں کے ساتھ دلّی کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، یہ بات حافظ غلام رسول شوقؔ کو ناگوار بھی گزری اور انھوں نے اپنے حلقہ کے لوگوں سے یہ شکایت بھی کی کہ میرا شاگرد ہے مگر اب مجھے غزل نہیں دکھاتا اور میرے ساتھ مشاعروں میں نہیں جاتا۔

ذوقؔ نے اس کی کوئی خاص پرواہ نہ کی، احمد حسین لاہوری نے اپنی کتاب حیاتِ ذوق میں یہی کہا ہے کہ حافظ غلام رسول شوقؔ کی اصلاح سے وہ بہت جلد غیر مطمئن ہو گئے کہ حافظ صاحب کو فن شاعری اور شعر گوئی کے بارہ میں جو کچھ شد بد آتا تھا وہ تو سیکھ لیا اب کسی اچھے مشاق استاد کی شاگردی ضروری تھا۔

شاہ نصیر کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی نے عوام کے دلوں کو تسخیر کر رکھا تھا کیا مجال کہ ان کے چُست کلام میں ذرا بھی سُستی کا نشان ہو، اصلاح بہت جلد دیتے تھے اور یہ اصلاح نہایت برجستہ ہوتی تھی۔[۱]

## شاہ نصیر سے اختلاف

ذوقؔ، شاہ نصیر کے باقاعدہ طور پر کتنے دنوں تک شاگرد رہے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لی اس کے بارہ میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ ان کے اور شاہ نصیر کے درمیان یہ سلسلۂ اصلاحِ سخن زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا اور بہت جلد استاد شاگرد کے مابین ایک گونہ شکر رنجی کی نوبت آگئی جس کی پرچھائیاں مولوی محمد حسین آزاد کے اس بیان میں بھی ملتی ہیں۔

اصلاح شعر کا سلسلہ جاری تھا مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ واہ طبیعت کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشکؔ جو تلامذ الرحمن (شاعروں) کے آئینہ کا جوہر ہے استاد شاگرد کو چمکانے لگا ـــــ بعض موقعوں پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزلوں کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو بعض

---

[۱] حیات ذوق: ۲۱، ۲۲

غزلوں کو جو اصلاح دی تو اس سے بے اوائی پائی گئی ؛،

ادھر کچھ نویاروں نے چمکایا کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں دانستہ یہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی مرتبہ غزلیں بے اصلاح پھیر دیں بہت سے اشعار کٹ گئے۔

زیادہ قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیرؔ، جو طبیعت کی بّراقی (تیزی) میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے، وہی مضمون پاتے گئے اس لیے انھیں زیادہ رنج ہوا۔

منیرؔ مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اس سے زیادہ طبیعت میں جوانی کے زور بھرے ہوئے تھے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور کہتے تھے جس غزل پر ہم قلم اٹھائیں اس زمین میں اور کون قدم رکھ سکتا ہے، ان سے اور شیخ مرحوم (میاں ذوق) سے اکثر" باقتضائے سن، تکرار ہو جاتی تھی"۔[۱]

اس طرح کی باتیں جو ذہنی اختلاف کا سبب بنتی گئیں، وقتاً فوقتاً پیش آتی رہی ہوں گی جس کی بڑی وجہ اس زمانہ کا شعری مزاج اور شاعرانہ مسابقت کا وہ جذبہ ہو سکتا ہے جس کے زیر اثر اس زمانہ کے شعرا اور استادانِ سخن گروہ بندیوں میں مبتلا ہوتے جاتے تھے ذوق کے مقابلہ میں شاہ نصیرؔ اگر اپنے بیٹے شاہ وجیہہ الدین منیرؔ کو آگے لانا چاہتے ہوں تو یہ بھی کوئی خلاف قیاس بات نہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان تعلقات کی کشیدگی میں مالی اعتبار سے ذوق کی کم مائیگی کو دخل ہو چونکہ شاہ نصیر بڑی فرمائشی طبیعت رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں سے کچھ نہ کچھ چاہتے اور منگاتے رہتے تھے ذوق ایک غریب باپ کے بیٹے تھے اور شاہ صاحب کی آئے دن کی فرمائش کو پورا کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

لیکن تعلقات کی یہ خرابی اس وقت زیادہ آگے بڑھی جب شاہ نصیر کے دکن چلے جانے پر غالباً ان کے اور شاہ وجیہہ الدین منیرؔ کے درمیان مقابلے ہوئے۔

---

[۱] دیوان ذوق : مرتبہ آزاد : ۳۰

# ذوق اور قلعۂ معلّٰی

قلعۂ معلّٰی تک ذوقؔ کی رسائی اور مرزا ابوظفر شہزادہ ولی عہد کے دربار میں ان کی باریابی کے سلسلہ میں، مولوی محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے ۔

"شیخ مرحوم کو اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی طرح دربار ولی عہدی تک رسائی ہو جائے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی حاصل ہو، ان دنوں کسی امیر کی سفارش اور ضمانت کے بغیر قلعہ میں پہنچنے کے لیے بادشاہی اجازت ممکن نہ تھی ۔"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں یہ مشورہ کسی دوست نے دیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھایا تھا کہ میر کاظم حسین بے قرار، آپ کے استاد بھائی اور ولی عہد کے ملازمِ خاص ہیں، ان سے کیوں نہیں کہتے اگر وہ سلسلہ جنبانی کریں تو سب کام بہ آسانی ہو سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا بھی، اپنے اسی استاد بھائی کے وسیلے سے ذوقؔ قلعۂ معلّٰی اور دربار ولی عہدی میں پہنچے اور گاہ گاہ وہاں آنے جانے لگے ۔

اس وقت اُن کی عمر انیس برس تھی جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء کا واقعہ ہے ۔

دہلی کی ادبی و تہذیبی زندگی میں قلعۂ معلّٰی کی بڑی اہمیت تھی ۔ قلعہ کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور اس زمانہ کے بہترین زباں دانوں اور فن شعر کے ماہروں کے قلعہ کی بزم شعر و سخن سے تعلق اور اس نسبت کی وجہ سے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

ناسازگاری حالات کے باوجود شاہی دربار کی طرف سے اہل سخن اور ارباب فن کی قدر افزائی اور سرپرستی بھی ہوتی رہتی تھی ۔ اس زمانہ کے ادبی مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے ۔ حکیم قدرت اللہ قاسم (صاحب مجموعہ ) کے بیان کو یہاں مختصراً پیش کیا جاتا ہے ۔

" حضرت والا کے رات دن کے اوقات کا ایک خاصا بڑا حصہ اس شغل شریف میں صرف ہوتا تھا جسے شعر و شاعری کہا جاتا ہے ۔ خواہ یہ شاعری فارسی زبان میں ہو یا ریختہ یا پھر ہندی بھاکا اور سنسکرت میں ہو ۔ اس خاص وقت میں

شہر کے نکتہ داں اور شیریں زبان شاعر دربار شاہی میں حاضر ہوتے تھے بادشاہ کی ارفع و اعلیٰ پسند اور طبیعت کے مطابق اپنا کلام سناتے اور اپنے کمال کی داد پاتے تھے ؛"

شاہی دربار میں اس زمانہ یا اس سے کچھ پہلے جن نامور شعرا کی آمد و رفت تھی ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر غالب علی سیدؔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، برہان الدین خاں زارؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ ان کے صاحبزادے میر عزت اللہ عشقؔ، میاں شکیبا شاگرد میر تقی میرؔ، مرزا عظیم بیگ شاگرد مرزا سوداؔ، میر قمرالدین منتؔ ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنونؔ وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے تھے اپنا اپنا کلام سناتے مطلع اور مصرعہ جلسہ میں ڈالتے ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا اور مصرعہ پر مصرعہ لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔[۱]

یہ اس وقت سے کچھ زمانہ پہلے کی بھی بات ہو سکتی ہے۔ بہر حال قلعہ معلّٰے اور شہزادۂ ولی عہد کا دربار اس دور کی دلی کا ایک بڑا ادبی مرکز تھا۔ اور ذوقؔ کی وہاں تک رسائی ان کی آئندہ زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

الغرض ذوقؔ اپنے دوست میاں کاظم حسین بے قرارؔ کے وسیلہ سے قلعہ معلّٰے میں پہنچے اور ولی عہد بہادر، مرزا ابوظفر کے دربار میں آنے جانے لگے

شہزادۂ ولی عہد مرزا ابوظفر شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے مگر بعض ہم مذاق دوستوں سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہتے تھے۔ میر قدرت اللہ قاسمؔ نے اس ضمن میں اپنے صاحبزادے میر عزت اللہ عشقؔ کا بھی ذکر کیا ہے اور مولوی محمد حسین آزادؔ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ذوقؔ کے دوست میر کاظم حسین بے قرارؔ بھی ولی عہد کی غزل بناتے تھے۔

شاہ نصیرؔ اس وقت کی دہلی کے بڑے مشاق اور استادانہ طمطراق والے شاعر تھے ان کے سامنے کسی کا چراغ جلنا آسان نہ تھا مگر وہ دلی میں انگریزی عمل داری قائم ہو جانے (۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ) کے بعد کسی وقت دہلی سے باہر چلے گئے تھے مولوی محمد حسین آزادؔ

---

[۱] آب حیات : ۱۲ - ۴۰

نے آب حیات میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اگرچہ دربار کے علاوہ تمام شہر میں اُن کی قدر اور عزت ہوتی تھی مگر جن لوگوں کی عادتیں ایسے درباروں میں بگڑی ہوتی ہیں اُن کے دل تعلیم یافتہ حکومتوں میں نہیں لگتے۔ اسی واسطے جب عمل داری انگریزی ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا۔[1]

شاہ نصیر کے دکن چلے جانے کے بعد کچھ دنوں تک یہ خدمت میر کاظم حسین بیقرار نے انجام دی اور جب وہ بھی مسٹر جان الفنسٹن کے میر منشی بن کر صوبہ جات شمال مغرب کی طرف رخصت ہوگئے تو شہزادہ ولی عہد کی نگاہِ انتخاب ذوق پر پڑی جس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک دن یہ ولی عہد کے یہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے میاں ابراہیم استاد تو دکن گئے، کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ شیخ مرحوم نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کہا بندہ جہاں ہوتا ہے وہیں دعا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ غرض کہ اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل پڑھ کر سنائی ــــ اس غزل کو سن کر خوش ہوگئے اور کہا بھئی، کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔[2]

اُس وقت غزل بنانے کی نوعیت کچھ ایسے ہی مشورۂ سخن کی ہوگی جو ولی عہد بہادر مرزا ابوظفر بعض دوسرے دوستوں سے بھی کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد ولی عہد کی طرف سے چار روپے ماہوار اُن کی تنخواہ بھی مقرر ہوگئی لیکن ابتدا میں ذوق کے تعلقات ولی عہد سے کچھ زیادہ گہرے نہیں تھے اس کی وجہ کشیدگی کی وہ فضا بھی ہو سکتی ہے جو مرزا ابوظفر اور ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے درمیان ولی عہدی کے مسئلہ پر تھی (اور جس کی وجہ سے ذوق کے والد نے اپنے بیٹے کو ولی عہد کی ملازمت سے منع بھی کیا تھا)

یہ زمانہ وہ تھا کہ بادشاہ سلامت اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کی خاطر سے کبھی مرزا سلیم اور کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شہزادوں کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے اور کہتے تھے

---

[1] آب حیات: ۱۲-۴۰ [2] آب حیات: ۴۲۵

مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں ہیں ۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولی عہد کو بجائے پانچ ہزار کے پانچ سو ملتے تھے۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب وداب کچھ اور تھا چنانچہ کچھ تو ولی عہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے اور کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے شیخ محمد رمضان نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔
لیکن ذوق نے اپنے والد کے کہنے کو منظور نہ کیا اور کہا انگریز جو آج سارے ہندستان کے مالک ہیں جب اس ملک میں آئے تھے تو ان کو سوداگر کی حیثیت سے، تھوڑی زمین کوٹھی کے لیے درکار تھی۔ اس وقت تھوڑی سی زمین لے کر وہ سارے ہندوستان کے بادشاہ بن گئے، تھوڑی بہی سی بہت ہو جائے گی یہ سن کر ان کے والد نے بھی زیادہ زور نہ دیا۔
لیکن سچ بات یہ ہے کہ اس وقت قلعہ سے تعلق کی بڑی اہمیت تھی چار روپے ماہانہ تنخواہ بھی ایک نوعمر شاعر کے لیے کچھ ایسی تھوڑی نہ تھی اور سب سے بڑی بات ولی عہد بہادر کی محفل شعر و سخن سے وابستگی تھی جس کے چرچے اس وقت کی دلی میں عام تھے اسی لیے بقول مولوی محمد حسین آزاد اُدھر تو شاعروں کے جھمگھٹ کی دل لگی نے اپنی طرف کھینچا ادھر قسمت نے یہ آواز دی کہ انھیں چار روپے نہ سمجھنا یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چنانچہ شیخ مرحوم ولی عہد کے استاد شاعری ہو گئے اور ان کی غزل بنانے لگے۔
ابتدا میں صورت حال جو بھی رہی رفتہ رفتہ ذوق کے تعلقات شہزادۂ ولی عہد سے استوار ہونے کے ساتھ دربار شاہی سے بھی کافی اچھے ہو گئے اور وہ بادشاہ وقت اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بحیثیت شاعر باریاب ہونے لگے۔ اس سے متعلق آب حیات میں ایک مبہم سی روایت ملتی ہے۔
کسی دوست نے فرمائش کی کہ " جسے ملا کر ساقیاں سامری فن آب میں " آج کل طرح ہوئی ہے آپ بھی غزل کہیں۔ آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق وشوق غزل، کبھی اس کا جا بہ جا چرچا ہوا۔ اکبر شاہ (جنت آرامگاہ) ان دنوں بادشاہ تھے انھوں نے فرمائش کی میاں ابراہیم سے کہو ہمیں خود آکر غزل سنائیں یہ ولی عہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے

ایک قصیدہ ان کی مدح میں کہہ کر شامل کردیا۔[۱]

اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کہی گئی غزل اور قصیدہ کے ساتھ ذوق پہلی بار اکبر شاہ ثانی کے دربار میں پہونچے ہوں گے۔ ذوق کے مسودوں میں ایک غزل ایسی بھی ہے جس میں غزل اور قصیدہ کے اشعار ایک ساتھ موجود ہیں لیکن اس سے یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ یہ اشعار کب کہے گئے اور کس کے لیے کہے گئے۔

شہزادۂ جہانگیر کی شادی کے موقعۂ پُرمبارک باد کے لیے جو قصیدہ ذوق نے پیش کیا اس کا زمانہ پیش کش ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت تک اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ان کی رسائی ہو گئی تھی اس قصیدہ نما نظم کے آخری شعر میں اس کی تاریخ موجود ہے

کہوں ہوں میں "لب" بستہ سے شادی فرزند
مبارک آپ کو ہو ۳۲ اے شہِ سپہر وقار

---

۱۱۹۳ ۳۲ ۱۲۲۵
(۱۸۱۰ء)

کچھ دنوں کے بعد شہزادۂ سلیم کی شادی کا جشن منایا گیا تو ذوق نے پھر ایک دھوم دھام کا قصیدہ لکھا۔

افق دل پہ میرے عیش و طرب دونوں بہم

مولانا محمد حسین آزاد نے اس موقع پر کہی جانے والی ایک مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے۔

"کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ مرزا ابوظفر عالم ولی عہدی میں تھے تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی تھی اس کی بحر دوسرے مثنویوں کی بحر سے الگ تھی لوگوں نے چرچا کیا کہ جائز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرزا حکیم محمد صاحب زندہ تھے میرے والد انہیں کا علاج کراتے تھے انھوں نے فرمایا رواج اتفاقی ہے جو مثنوی انہیں آٹھ بحروں میں منحصر ہو کر

---

[۱] آب حیات : ۴۵۵

رہ گئی ورنہ طبع سلیم پرکون حاکم ہے[1]"

اس روایت سے اُس زمانے کے ادبی ماحول اور شعر و شاعری سے متعلق لوگوں کے فنّی رویہ کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ شعر و سخن کی محفلوں میں کن باتوں کا چرچا ہوتا تھا کسطرح کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد دی جاتی تھی اور استاد بننے کے لیے فنِ شعر کے کن کن پہلوؤں پر نظر داری ضروری خیال کی جاتی تھی۔

## ذوقؔ اور مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ

شہر کی محفلوں میں ذوق کی شاعری کے چرچے ولی عہد اور بادشاہ کے دربار تک اُن کی ادبی اور مختلف موقعوں پر تہنیتی نظم یا قصیدہ کی پیش کش نے بعض کہنہ مشق شاعروں اور دہلی کے رئیسوں کو بھی اُن کی طرف متوجہ کر دیا ان میں نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ بھی تھے مولانا محمد حسین آزاد نے نواب صاحب کی خدمت میں ذوق کی رسائی کے واقعہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"نواب صاحب لطف کلام کے عاشق تھے اور جہاں متاعِ نیک (اچھی چیز) دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انہیں بھی اشتیاق ہوا یہ وہ موقع تھا کہ نواب موصوف نے اہل فقر کی صحبت کی برکت سے ترکِ دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

استاد مرحوم فرماتے تھے کہ انیس بیس برس کی عمر تھی گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کی نماز کے بعد میں وہاں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا ایک چوبدار آیا اس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا وظیفہ سے فارغ ہو کر اُسے دیکھا تو ایک خوشۂ انگور تھا۔

چوبدار نے کہا نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے آپ کا کلام تو پہنچا مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور بعد گفتگوئے معمولی کے

---

[1] آب حیات: ۴۶۹

شعر کی معمولی فرمائش کی انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی جس کا مطلع تھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر، پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور بھی لطف حاصل ہوا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں عجیب اتفاق ہے کہ حافظ غلام رسول شوقؔ بھی اس وقت آنکلے نوابؔ صاحب انھیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور میرے ساتھ مشاعروں میں نہیں چلتا . . . . شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی . . . . نوابؔ صاحب مرحوم نے کہا کوئی اچھا سا شعر سناتے جاؤ —— انھیں دنوں میں ایک غزل کہی تھی وہ مطلع اس کے پڑھے۔

جینا نظر اصلا ہمیں اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا [1]

بہر حال اس دن سے یہ معمول ہو گیا کہ ہفتہ میں دو دن جایا کرتے تھے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔

آگے چل کر اسی ضمن میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے

نوابؔ صاحب اگرچہ ضعف پیری کے سبب خود کاوش کرکے مضمون کو لفظوں میں نہیں بٹھا سکتے تھے مگر اس کی تہہ کو ایسا پہونچتے تھے جو حق ہے۔ اس عالم میں استاد مرحوم کی جوان طبیعت اُن کی فرمائش کے نکتہ نکتہ کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے اگرچہ بڑی کاوشیں اٹھانی پڑیں مگر ان کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے [2]

نوابؔ صاحب سے ذوقؔ کے تعلقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچھے خاصے زمانے تک رہے اور نواب صاحب اُن سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے —— اس سے

---

[1] آب حیات : ۴۵۸

[2] ایضا ۴۵۹

اختلاف بھی کیا گیا ہے کہ وہ نواب الہی بخش خاں معروف کی غزل بناتے تھے۔

## شاہ نصیر سے معرکہ آرائی

جب دہلی کی شعری مجلسوں اور سخن ورانہ مشاعروں میں ذوق کی شہرت بڑھی تو ان کے استاد شاہ نصیر دہلی سے باہر تھے جس کی وجہ سے ذوق جیسے صاحب استعداد اور نو عمر شاعر کے لیے طبع آزمائی اور قسمت آزمائی کے مواقع زیادہ تھے۔ ممکن ہے یہ واقعات شاہ نصیر کے سفر دکن کے دوران پیش آئے ہوں اسی لیے جب شاہ صاحب واپس آئے تو دونوں کے درمیان ادبی کشمکش کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھ گیا۔

"حیات ذوق" کے مصنف احمد حسین لاہوری نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"... کہ لوگوں کی واہ واہ نے شیخ مرحوم کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ان کا کلام اصلاح کا محتاج نہیں اور اکثر جب غزل اصلاح کے لیے پیش کرتے تو کہا کرتے تھے کہ استاد یہ غزل بڑی عرق ریزی سے کہی ہے اگر کوئی شعر کٹ گیا تو کلیجہ نکل پڑے گا ـــــ یہ باتیں شاہ نصیر کو ناگوار گزریں ادھر انہیں یاروں نے چمکایا رفتہ رفتہ طرفین کے دل میں گرہ پیدا ہو گئی[1]"

یہ بھی ممکن ہے کہ ذوق کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت سے شاہ نصیر کے احساس برتری کو ٹھیس پہونچی ہو اور انھوں نے ذوق کے مقابلہ میں اپنے بیٹے شاہ وجیہہ الدین منیر کو آگے لانا چاہا ہو غالباً یہی وہ دور بھی ہے جب ان کے اور منیر مرحوم کے درمیان مسابقت کے جذبہ کے ساتھ، معرکۂ غزل گوئی کے مقابلے رہے ہوں گے منشی احمد حسین لاہوری نے اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔

" منیر مرحوم نے یہ میدان مار لیا مگر اُن کو یہ فتح اپنی لیاقت سے حاصل نہیں ہوئی استاد کی حمایت اور دوستوں کی طرف داری سے ہوئی۔ استاد کے لڑکے خلیفہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں اس لحاظ سے شاہ نصیر کو علانیہ منیر مرحوم سے ان کا مقابلہ کرنا سخت ناگوار گزرا اور یہ بھی ایک وجہ

---

[1] حیات ذوق : ۲۳

ناچاقی کی ہوئی تھی[1]

اس سلسلہ میں جو روایتیں ملتی ہیں ان میں ایک یہ روایت مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں سامنے آتی ہے۔

" اسی قیل وقال میں ایک دن مرزا سودا کی غزل پر غزل کہی ہم دوش نقش پا، ہم آغوشِ نقش پا' شاہ صاحب کے پاس لے گئے انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا"[2]

استادوں کی غزل پر غزل کہنا سوئے ادب ضرور خیال کیا جاتا تھا لیکن ایک ابھرتے ہوئے ہوئے شاعر کے لیے یہ فنی آزمائش بھی تھی جس سے ان کا اعتماد بڑھتا تھا ذوق کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے

... " اس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ ہوا' طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں برقی اثر کی طرح دوڑنے لگی۔ اس زمانے کے لوگ منصف مزاج ہوتے تھے' بزرگانِ پاک طینت' مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے... غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اڑانے لگیں"[3]

کہا جا سکتا ہے کہ شاہ نصیر نے اپنے اس ہونہار شاگرد سے استادانہ خلوص برتنا چھوڑ دیا ہو اور اس طرح کی کچھ باتیں کیں جن سے ذوق کی بڑھتی ہوئی شہرت کو نقصان پہونچے۔

اسی طرح کی گفتگو ہم ایک دوسری غزل کے بارہ میں بھی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں

" جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو"

جب یہ غزل لکھی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی آواز گئی ساتھ ہی دوسری غزل اور بحر میں کہی —— اس دوسری غزل پہ ناخوشی پھوٹ پڑی اور کہا کہ اس

---

[1] حیات ذوق: ۲۴ [2] ایضاً [3] آب حیات: ۴۳۵

اس بحر میں غزل کسی نے نہیں کہی یہ جائز نہیں۔ گھبرا گئے مولوی شاہ عبدالعزیز ان دنوں زندہ تھے ان سے جا کر حال بیان کیا انھوں نے فرمایا معترضین بے خبر ہیں فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں کہی ہیں خوش آئند بحروں کا نکالنا حسن طبع ہے نہ کہ عیب۔"

ایک اور غزل کے سلسلہ میں اسی طرح کی کچھ باتیں سامنے آئیں۔

"شاہ نصیر سے اصلاح بند تھی مگر آمد و رفت اسی ادب و تعظیم کے ساتھ جاری تھی جو سعادت مند شاگردوں کا حصہ ہوتا ہے ان کی خدمت میں گئے تو غزلیں بھی سنائیں انھوں نے کہا خوب غزلیں کہی ہیں دوسری غزل بہت خوب ہے اسے مشاعرے میں پڑھنا۔

ذوق مشاعرے میں گیے تو فرمائش کا خیال کر کے اس غزل کو بھی لیتے گئے اور غزل پڑھنے کے بعد شاہ نصیر سے کہا اگر اجازت ہو تو فرمائش کی تعمیل کروں انھوں نے کہا "ہاں بھئی سنانے کی جگہ تو یہی ہے" اتفاق یہ کہ اس غزلِ دوم کے مطلع میں "پھر کا" لفظ موجود نہ تھا جب ذوق نے مطلع پڑھا تو شاہ صاحب نے اس کی تعریف معمول سے زیادہ کی اور کہا بھئی میاں ابراہیم یہ مطلع پھر پڑھنا۔" رُکے کہ یہ کیا بات ہے۔ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا اور لفظ بھی دے دیا یہ ترمیم ایسی فی البدیہہ ہوئی کہ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ نوجوان شاعر کی شوخیٔ طبع تھی، پھر اعتراض ہوا کہ اس بحر میں غزل کسی نے نہیں کی، شیخ مرحوم (ذوق) نے جواب دیا کہ ۱۹ بحریں آسمان سے نازل نہیں ہوئیں طبع موزوں نے نئے نئے گل کھلائے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد کے بیان کردہ ان واقعات میں ممکن ہے رنگ آمیزی کی کوشش کو بھی کچھ دخل ہو مگر اس طرح کے واقعات سے اس دور کے مشاعروں کی فضا اور ذوق و شاہ نصیر کے مابین معاصرانہ چشمک اور اختلاف کا کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

شاہ نصیر اور ذوق کے مابین شاعرانہ چشمکوں اور مقابلوں کا سلسلہ بہت زمانے تک چلتا رہا اور دلی سے شاہ صاحب کی غیر حاضری کی وجہ سے اس میں لمبے لمبے وقفے بھی غالباً آتے رہے۔ اس سلسلے میں پیش آنے والے ایک اور واقعہ

کا ذکر اس طور پر کیا گیا ہے۔

کئی برس کے بعد شاہ نصیر دکن سے پھرے اور اپنا مشاعرہ حسب دستور جاری کیا ذوق نے مشاعرے میں جاکر غزل پڑھی شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی غزل کہی تھی جس کی ردیف "آتش و آب و خاک و باد" تھی۔ غزل مشاعرے میں سنائی اور کہا اس طرح میں ، جو غزل کہے میں اسے استاد مانتا ہوں۔

یہ گویا ذوق پر ایک طرح کا طنز بھی تھا جو ولی عہد بہادر کی غزل بناتے تھے اور استاد کہلاتے تھے۔ جو بھی صورت ہو ذوق نے دوسرے مشاعرے میں اس پر غزل پڑھی شاہ صاحب کی طرف سے اس پر بجائے خود کچھ اعتراضات ہوئے۔ جشن قریب تھا۔۔۔ ذوق نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا۔ مولوی شاہ عبدالعزیز (وفات ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۱۲۵ء) کی خدمت میں لے گئے انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی۔

ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کہا تھا وہی جواب میں لکھدیا۔۔۔ دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے کئی دن کے بعد سنا کہ اس پر اعتراضات لکھے گئے ہیں۔ ذوق قصیدہ کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو بر سر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔

اس زمانہ میں ایسا ہوتا بھی تھا۔ بر سر مشاعرہ دوسروں کے کلام پر اعتراضات ہوتے اور حریف کو نیچا دکھانے کے لیے برجستہ اصلاح بھی دی جاتی تھی کہ اعتراض کرنے والے کی قدرتِ کلام کا اظہار ہو سکے۔

ایسے ایک اور مشاعرے کا ذکر (مولوی محمد حسین آزاد کے علاوہ مرزا قادر بخش صابر نے (اپنے تذکرہ گلستان سخن میں) کیا ہے۔ منشی فیض پارسا، شاہجہاں آباد کے مدرسہ میں فنِ تعلیم حساب پر مامور تھا" (یہاں) اس بزرگ کی تکلیف سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس میں مشاہیر شعرائے دہلی شاہ نصیر حکیم مومن خاں مومن، شیخ ابراہیم ذوق اور ان کے تلامذہ اور دوسرے موزوں طبعان شہر (شاعر)، جمع ہوتے تھے۔

شاہ نصیر انہیں ایام میں سفر لکھنؤ سے وارد شاہجہاں آباد ہوئے تھے

انھوں نے شریک مشاعرہ ہو کر دو غزلیں، تازہ زمین کہ شعرائے لکھنؤ کی فرمائش سے کہی تھیں بہ طریق تکرار کے پڑھیں۔

ہم پھڑک کر توڑتے ساری قفس کی تیلیاں
پر نہ تھیں اے ہم صفیرو اپنے بس کی تیلیاں

---

برہمن اپنے بتوں کو بخدا سجدہ نہ کر
آدمِ مردہ ہیں بے گور و کفن پتھر تھے

---

بعض احباب نے اُس نظم کی بے حد تحسین کی وجہ سے حسد کو کام فرمایا اور اپنے بعض شاگردوں کو ان دونوں زمینوں میں غزل کہنے کی تکلیف کی۔ خیرالدین یاس تخلص نے دوسری زمین میں ایک شعر خوب کہا تھا۔

مرہم سنگ جراحت سے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے زخموں کے ذہن پتھر کے

خیرالدین یاس ذوق کے شاگرد تھے، یہ بات شاہ نصیر کو ناگوار گزری اور پہلی زمین میں قریب پچاس غزل کہہ کر اپنے شاگردوں سے پڑھوائیں۔

اس حرکت سے حسد کا بازار گرم ہوا اور اس جلسہ کے بعد شعرا نے یہ التزام کیا کہ ہر مشاعرے میں اس زمین میں غزلیں پیش ہوں غرض کہ کتنے مہینے تک اس ردیف کی غزلوں کے ماسوا اور کچھ نہ کہا۔

اور لوگ آٹھ آٹھ نو نو شعروں کے سوا نہ پڑھتے تھے شاہ نصیر کی ہمت پر ہزار آفرین ہے کہ ہر بار دو غزلہ سہ غزلہ ساٹھ ساٹھ شعر ستر ستر شعر کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل اکیس بیس بیت سے کم نہ ہوتی تھی۔

ذوق نے اُس زمین میں ایک قصیدہ حضرت ظلِ سبحانی آیۂ رحمت ربانی کی مدح میں پڑھا اور یہ وہ دور تھا کہ حضرت بادشاہ سلامت ہنوز ولی عہد تھے۔ کہتے ہیں کہ اِس قصیدہ میں بڑی جودت الفاظ اور جدت معنی صرف کی گئی تھی لیکن جس وقت وہ قصیدہ پڑھا گیا بزم مشاعرہ درہم برہم ہو چکی تھی اور شاہ نصیر اور

رر چار سامعین کے سوا اور کوئی بزم مشاعرہ میں موجود نہ تھا۔[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں شاعرانہ مشق و مہارت مشکل پسندی اور زود گوئی کو بڑی بات سمجھا جاتا تھا —— اور اسی کو شاعر کی قادر الکلام کا معیار تصور کیا جاتا تھا۔

## خاقانی ہند کا خطاب

ذوق کو اپنے شاگرد اور شہزادہ ولی عہد مرزا ابوظفر کے والد، شاہ وقت، اکبر شاہ ثانی کے دربار سے اُن کے ایک قصیدے پر "خاقانی ہند" کا خطاب ملا۔ یہ ادبی اعتبار سے ایک بہت بڑا خطاب تھا اس لیے دہلی کے شہری حلقوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ اہل سخن میں بہت دنوں تک چہ می گوئیاں ہوتی رہیں کہ بادشاہ نے ایک نو عمر شاعر کو "خاقانی ہند" بنا دیا۔ یہ ذوق کے کمال قصیدہ گوئی کا اعتراف تھا کہ اُسے فارسی زبان کے ایک بہت معروف و ممتاز شاعر خاقانی شروانی کی طرح قصیدہ نگاری میں ایک مسلم الثبوت استاد تسلیم کر لیا جائے۔

ذوق کے اس ادبی خطاب کا ذکر ان کے ہم زمانہ اور بعد کے ادبی تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں کے یہاں برابر آتا رہا لیکن یہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہ خطاب اُن کو کب ملا تھا، مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ۱۹ برس کی عمر میں یہ خطاب عطا ہوا۔ (جس کے معنی ہیں کہ انھیں یہ خطاب ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں ملا تھا) اس سے اختلاف کی گنجائش ہے خاص طور پر اس لیے کہ دہلی اردو اخبار نے جو ضمیمہ ذوق کی وفات پر شائع کیا تھا اس میں یہ کہا گیا ہے کہ انیس برس کی عمر میں وہ مرزا ابوظفر کے دربار میں پہونچے تھے اس وقت تک، تو ولی عہدی کا قضیہ بھی پوری طرح طے نہ ہوا تھا اور شہزادے اور بادشاہ کے تعلقات بھی اچھے نہ تھے۔ یہ خطاب ظاہر ہے کہ اس کے بعد کسی وقت ملا ہوگا۔

دہلی اردو اخبار کے اس ضمیمہ میں ان کے خطاب "خاقانی ہند" کے سلسلہ

---

[1] ملاحظہ ہو گلستان سخن: ۶۲-۶۲

میں لکھا گیا ہے۔

ایک قصیدہ مدح اعلیٰ حضرت میں کہہ کر پڑھا جس میں صنائع و بدائع متکاثرہ (بہت سی اور طرح طرح کی صنعتیں) استعمال کی گئی تھیں علاوہ بریں ایک عجیب و غریب صنعت اس میں یہ تھی کہ اٹھارہ شعر اٹھارہ زبانوں میں تھے ہر ایک شعر ہر ایک بولی میں علیٰحدہ تھا مثلاً فارسی عربی ترکی، حبشی، پنجابی، بھاشا، شاستری، مارواڑی، بنگالی، میسوری جھنگ سیانہ، انگریزی، جرمنی، لاطینی وغیرہ کہ انشاء اللہ واسطے ملاحظہ ناظرین کے درج کیا جائے گا جس پر خاقانی ہند کا خطاب ملا۔[1]

دہلی اردو اخبار یا اس زمانے کے کسی دوسرے اخبار میں ابھی تک یہ قصیدہ نہ مل سکا مولانا محمد حسین آزاد نے اس کا صرف مطلع درج کیا ہے۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

ذوق کے دیوان میں بھی جو ان کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگردوں حافظ غلام رسول ویران، ظہیر دہلوی اور امراؤ مرزا انور نے مرتب کیا اس میں اس کے دو تین متفرق شعر ہیں اور بس۔

ذوق شہزادۂ ابوظفر کے دربار سے وابستہ تھے اور شاہی دربار میں بھی وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے اور قصیدے پیش کرتے رہتے جس پر صلہ و انعام سے بھی نوازے جاتے ہوں گے اگرچہ اس کی کوئی تفصیل ان کے سوانح نگاروں کے یہاں خطاب "خاقانی ہند" کے ذکر کے ماسوا نہیں ملتی۔

## بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی

سنہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۶ / اکتوبر سنہ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر مرزا ابوظفر، سراج الدین بوظفر بہادر شاہ ثانی کے نام سے قلعۂ معلےٰ میں تخت نشین ہوئے اس

---

[1] ے

مبارک موقعہ پر ذوق نے ایک شاندار قصیدۂ تہنیت پیش کیا۔

ہیں آج کیا ہی خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

اسی پر ان کو دربار شاہی سے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا گیا بعض تحریروں میں اسے سلطان الشعراء بھی لکھا گیا ہے۔

## ذوق کی شاعرانہ مقبولیت

ذوق کی زندگی کے واقعات زیادہ تر ان کی شاعرانہ زندگی اور دہلی کے سخنورانہ معرکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عزیز شاگرد مولوی محمد حسین آزاد کے علاوہ بعض واقعات دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں ۔ ذوق اپنے استاد شاہ نصیر کی طرح قدر دانی کے شوق میں کبھی دہلی سے باہر نہیں گئے دلی کی گلیوں ہی میں ان کا کلام مقبول ہوا اور ان کی شاعرانہ شہرت دور دور پھیل گئی دہلی کے ادبی حلقوں میں، وہ بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے زبان اور محاورہ پر اُن کی دسترس کو سند مانا جاتا تھا۔ دور دور سے لوگ دہلی آکر ان کے شاگرد ہوتے تھے یا ان سے غائبانہ اصلاح لیتے تھے۔

شاہی مشاعروں میں وہ بادشاہ کا کلام گاہ گاہ خود پڑھکر سناتے تھے جو ان کے لیے ایک بڑا اعزاز بھی تھا "دہلی اردو اخبار" نے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"روز یک شنبہ کو دیوان عام میں دھوم دھام سے مشاعرہ ہوا حضور والا کی طرف سے میر مشاعرہ شہزادہ عالی جاہ مرزا نور الدین بہادر ظاہر کیے گئے حضور والا کا کلام خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق نے پڑھا اور شاعروں نے اپنی اپنی تصنیفیں پڑھیں صبح حضور اقدس کے سامنے منتخب غزلیں پڑھی گئیں"[1]

---

[1] تمر دہلی اردو اخبار : ۱۸۵۲ء

ذوق کی شاعرانہ زندگی ادبی — محفلوں میں شرکت فرمائی کے ساتھ بسر ہوئی وہ اپنے لیے بہت کچھ کہتے تھے شاگردوں کی غزلیں بھی بناتے اور شاہی دربار سے بحیثیت استادِ سخن اپنی وابستگی کے باعث اپنے منصبی فرائض کو بھی انجام دیتے تھے۔

## بادشاہ سے عقیدت

مولانا محمد حسین آزاد نے اس روایت کو ایک اور موقع پر اس طرح پیش کیا ہے۔
جب یہ بادشاہ ہوئے اور مغل بیگ وزیر بنے تو وزیرِ شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا مگر استادِ شاہی کو تیس روپے مہینہ پھر بھی انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کیا کرتے تھے جب کوئی عالی مضمون چستی و درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے . . .

ذوق اس تنخواہ کو جو انھیں ملتی تھی اپنے کمال فن سے فروتر خیال کرتے ہوں یہ بالکل ممکن ہے لیکن اس کی وجہ سے اُن کی وفاداری میں کبھی کوئی خلل نہیں پڑا بادشاہ سے انھوں نے کبھی شکایت بھی نہیں کی۔

## ذوق کے ساتھ ناانصافی

بادشاہ ان کا مزاج داں اور قدرشناس تھا شاہی دربار میں وہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے لیکن ان کے شاعرانہ مرتبہ کے لحاظ سے ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس کی وجہ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ لکھی ہے۔
"اگرچہ مرزا ابوظفر انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے مگر دربار میں مغل بیگ مختار تھے جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے مواقع آئے تو استاد کے لیے یہ ہوا کہ چار روپے سے پانچ روپے ہو گئے لیکن جب مغل بیگ کی ترکی تمام ہوئی، تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہو گئے تو استادِ شاہی کا سو روپیہ مہینہ ہوا۔

---

۱؎ آب حیات : ۴۷۳

ذوق کے اس نوع کی ناانصافیوں کی وجہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ انھیں اپنے بادشاہ سے غیر معمولی عقیدت تھی اور وہ قلعۂ معلّیٰ اور اس کے شاہی دربار سے اپنی وابستگی کو لائق شکر تصور کرتے تھے اور اسے اپنے لیے بڑی نعمت تصور کرتے تھے۔

## ذوق اور دہلی کے بعض مشاعرے

دہلی کی شعری مجلسوں سے ان کی دلچسپی کم وبیش ہمیشہ باقی رہی وہ ان محفلوں کے اہم رکن بھی تھے۔ ان کو اکثر ہم مشاعروں ہی میں آتے جاتے اور اپنا کلام پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

مولینا محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کا ذکر اس طور پر کیا ہے "شمع نازاں نہ ہوا اک رات بہا آنسو گرم" فرماتے تھے ایک مشاعرے میں یہ زمین طرح ہوئی ہم نے کہا یہ زمین تو گرم ہے مگر تاثیر ٹھنڈی ہے میر مشاعرہ نے کہا خیر اب تو ہو گئی جب مشاعرہ ہوا تو جلسہ میں جو بھی آیا نالاں روتا ہوا آیا"۔[1]

ایک اور مشاعرہ کا ذکر اس طرح آیا ہے۔ ـــــــــ

شاہ نصیر مرحوم تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قائم ہوا اس میں یہی طرح تھی "دانۂ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو" استاد (ذوق) نے دو غزلہ پڑھا تھا قافیہ کی تنگی سے دق ہو کر . . . آسانی طرح کا اظہار کیا ہے

ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

اس میں شاہ نصیر کی پیرانہ سالی کی طرف اشارہ ہے۔[2]

۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں مرزا خدا بخش نام ایک شہزادے نے قلعہ میں مشاعرہ کیا حضور بادشاہ سلامت سے بھی غزل کا وعدہ لیا استاد سے بھی کہا اور اقرار لیا۔ شہزادۂ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے غرض کہ مشاعرے میں گئے غالب مرحوم مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے حضور بالاتشریف

---

۱؎ دیوان ذوق، مرتبہ آزاد: ۱۲۰ ۲؎ ایضاً ۱۲۹

رئے اور پس پردہ بیٹھے حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص تھے انھوں نے استاد سے پوچھا کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ بموجب آئین مشاعرہ پہلے شمع وسط مجلس میں رکھی گئی ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس بیٹھا اور حضور کی غزل سنائی گئی۔[1]

## شہزادہ جواں بخت کی شادی

ذوق کے آخری زمانۂ زندگی میں جو واقعات پیش آئے ان میں ادبی تاریخ کے لحاظ سے سب سے اہم واقعہ شہزادہ جواں بخت کی شادی سے متعلق ہے اس موقعہ پر مبارک باد کے لیے جو اشعار پیش کیے گئے ان میں وہ سہرا خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے جو نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی فرمائش پر مرزا غالب نے کہا اور کشتی زر میں سجا کر اسے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا اس سہرے کا مقطع بہت معنی خیز تھا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

اس مقطع کو دیکھ کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے کہ ہم نے شیخ ابراہیم ذوقؔ کو اپنا استاد اور ملک الشعرائے دربار بنایا ہے — اس کے جواب میں استاد سے سہرا کہنے کی فرمائش کی استاد نے بھی غالبؔ کے اس بہت خوبصورت سہرے کے جواب میں اتنا ہی اچھا ایک سہرا کہا اور مرزا غالبؔ کے معنی خیز مقطع کا جواب اس انداز سے پیش کیا

جن کو دعوائے سخن ہو یہ سُنا دوان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا غالبؔ نے موقع کی اس نزاکت کو محسوس کیا اور بجا طور پر یہ سمجھا کہ مقطع کی بات بادشاہ کو ناگوار گزری تب ہی تو استاد شاہ سے جواب میں سہرا کہلوایا گیا اور مقطع میں موجود شاعرانہ تعلّی کا جواب اس طور پر آیا۔

---

[1] دیوان ذوق مرتبہ آزاد: ۱۳۲

فوراً ایک قطعہ بطور معذرت لکھا اور اس میں اس کا اظہار کیا۔

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

---

اس پر بھی بادشاہ کا دل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاف نہیں ہوا اُسی زمانے میں مرزا غالب نے فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھ کر حضور شاہ میں پیش کیا اسکی ردیف "گرہ" تھی جس کے پہلے مطلع میں یہ اشارہ موجود ہے کہ ردیف گرہ اس خاص وجہ سے اختیار کی ہے کہ میری طرف سے ابھی تک ابروئے شہریار میں شکن پڑی ہوئی ہے۔

ردیف شعر ازاں کردم اختیار گرہ
کہ از من است برابروئے شہریار گرہ

# آخری دور کے قصیدے اور قطعات

بہادر شاہ اپنی چہیتی ملکہ زینت محل کے ایما پر اپنے نوعمر بیٹے مرزا جواں بخت بہادر کو اپنا ولی عہد بنایا یہ قضیہ میران شاہ محمد دارا بخت بادشاہ کے بڑے بیٹے اور ولی عہد کی وفات کے بعد سامنے آیا تھا لیکن انگریزوں نے اپنی طے شدہ پالیسی کے تحت مرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کیا اور پھر بادشاہ کو بھی یہی ماننا پڑا اور اس پر اظہارِ خوشنودی کیا۔

اس مبارک موقعہ پر ذوق نے فی البدیہہ یہ قطعہ تہنیت موزوں کر کے پیش کیا۔

دُعا ہے ذوق کی، ہو خلعتِ ولی عہدی
مبارک آپ کو، با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
بحق سورۂ "والشمس" و "آیۃ الکرسی"

---

اسی زمانہ میں کچھ آگے ہیں چل کر بہادر شاہ ظفر سخت بیمار ہو۔ تہ اور بچنے کی امید نہ رہی، حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی کی مسیحانہ کوشش اور تدبیر علاج کامیاب ہوئی اور بادشاہ نے صحت پائی جب بادشاہ کا جشن صحت منایا گیا تو شعرائے دربار نے صحت یابی کی مبارک باد کے لیے قطعات و قصائد تہنیت، نذر کیے مرزا غالب نے اپنی ایک خوبصورت غزل کی صورت میں نذرانہ تہنیت پیش کیا۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

---

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

---

ملکہ زینت محل نے بھی دو قطعے کہہ کر نذر گزرانے جنھیں بادشاہ نے بہت پسند کیا اور اس زمانے کے اخبارات نے بھی ان کی بہت تعریف کی۔

ذوق کی طرف سے ایک بہت شاندار قصیدہ تہنیت پیش کیا گیا ؎

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

---

جو ذوق کے نہایت اعلیٰ قصائد اور بہترین شعری تخلیقات میں سے ہے جس کے صلہ میں ان کو ایک زنجیر فیل (ہاتھی)، اور ایک شاہی انگوٹھی انعام ہوئی اور چار سپاہی ان کی خدمت کے لیے مقرر کیے گئے

اس کے بعد پھر ایک اور زبردست قصیدہ لکھ کر عید قربان (بقر عید) کے جشن کے کے موقعہ پر نذر گزرنا،

شب کو میں اپنے سرِ بستر خواب راحت
نشہ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

اس قصیدے کی فضا غیر معمولی طور پر علمی اور کلاسیکی معیاروں کے مطابق ادبی ہے اس میں اٹھارہ علوم و فنون کی اصطلاحوں اور تلمیحوں کو استعمال کیا گیا ہے ذوق کی شاعرانہ زندگی اور قصیدہ نگاری کے فن میں ان کا یہ قصیدہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے اس پر انھیں ایک گاؤں انعام میں دیا اور یہ کہا کہ اس قصیدے کے لحاظ سے میں کوئی انعام نہیں دے سکتا۔

# آخری ایام

اس کے بعد کی کہانی اُن کی زندگی کے آخری ایام کی کہانی ہے جن میں انھوں نے پہلے سے نامکمل پڑی ہوئی مثنوی کو مکمل کرنے کی کوشش کی مگر وقت نے مہلت نہ دی۔ ۵ ا صفر ۱۲۷۱ء مطابق ۱ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو عارضہ بخار میں مبتلا ہوئے تین دن کے بعد بخار سے افاقہ ہو گیا لیکن مرض پیچش لاحق ہو گیا انجام کار عارضہ بواسیر کی شکایت زیادہ تھی ضعف اس شدت سے تھا کہ بیان سے باہر ہے۔[1]

مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق کی زندگی کی آخری ساعتوں کی اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> جمعرات کی صبح ہوتے انتقال ہوا انتقال سے قریب روز پیشتر قریب شام میں بھی موجود تھا کہ انھیں پیشاب کی حاجت ہوئی خلیفہ صاحب نے اٹھایا۔۔۔۔ ہاتھوں کا سہارا دیا انھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا طاقت نے یاری نہ دی تو کہا آہ ناتوانی خلیفہ صاحب نے کہا شاعروں ہی کا ضعف ہو گا۔ حافظ غلام ویران پاس بیٹھے تھے بولے آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں مسکرا کر فرمایا اب تو اس سے بھی زیادہ ہے میں نے کہا سبحان اللہ اس عالم میں بھی مبالغہ قائم ہے خدا اسی مبالغہ کے ساتھ صحت دے۔[2]

اسی عالم میں، مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا۔

---

[1] تتمہ دہلی اردو اخبار : [2] آب حیات : ۴۷۳

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

چند روز پہلے سے کھانا بالکل ترک کر دیا تھا صرف اوروں کی تشفی کے لیے کچھ دوا پی لیتے تھے آخر ۲۴ شب ماہ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۴ء شب آخر چہار شنبہ کو پہر رات گئے جاں بحق تسلیم کی۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون

—— اس طرح سترہ دن بیمار رہکر دنیا سے رخصت ہوئے۔

---

## ماتم ذوق

جیسے ہی استاد شاہ کی وفات کی خبر بادشاہ کو دی گئی حضور والا نے دربار کی برخاستگی کا حکم صادر فرمایا اور اہل دربار اور شہزادگان والا تبار سے کہا کہ وہ استاد کی نماز جنازہ میں شریک ہوں۔ دہلی اردو اخبار نے اپنے ضمیمہ میں یہ بھی لکھا کہ حضور والا مرزا دارا بخت مرزا شاہ رُخ مرزا فرخندہ شاہ وغیرہ کی موت پر بھی کبھی اس طرح اشکبار نہ ہوئے تھے جو استاد مرحوم کے واقعۂ جاں کاہ سے اضطراب ہوا کہ اس عالم میں چالیس برس کا ساتھ چھوٹا ہے۔

اس موقعہ حضور والا نے استاد مرحوم کا قطعۂ تاریخ بھی کہا اور کئی بار اسے دُہراکر استاد کی جاں نثاری کو یاد کیا۔

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر
بحکمِ خداوند، جاں داد ذوق
ظفر روے اردو بناخن زغم
خراشید و فرمود استاد ذوق

---

۱۲۷۲-۱=۱۲۷۱

چہار شنبہ (جمعرات) کو جنازہ اٹھا اور اس شان سے اُٹھا کہ جس کے لیے یہ مصرع کہا جا سکے

گماں تھا تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

---

ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں چند قدم زیادہ کاندھا دوں اور ایک ایک کے ہاتھ سے دوڑ کر جنازہ کو لیتا تھا، بوجھ جنازہ میں بالکل نہ معلوم ہوتا تھا۔¹

ذوق مرحوم کو ان کی اپنی وصیت کے مطابق درگاہ قدم شریف (قبرستان نبی کریم) میں دفن کیا اور مدفن ذوق اس قبرستان کے ایک ایسے گوشہ میں بنا یا گیا جو کلّو کا تکیہ کہلاتا تھا۔

حضور والا کی یہ خواہش تھی کہ انھیں قطب صاحب میں وہاں دفنایا جائے جہاں شاہی خاندان کے کچھ دوسرے افراد کے مزارات اور قبریں ہیں یا پھر کسی اور درگاہ متبرکہ میں لیکن ذوق کی اپنی خواہش کا احترام کیا گیا

پنج شنبہ جمعرات کے دن ذوق زیارتِ قدمِ مبارک رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاتے تھے اور صاحب زادے سے یہ اپنی زندگی میں کہدیا تھا کہ مجھ گنہگار کو قدم شریف کے گورستان میں سپردِ خاک کرنا۔

بہر حال دہلی اردو اخبار نے یہ خبر دی ہے کہ حضور والا نے واسطے تعمیر مقبرہ کے حکم فرمایا ہے جو عنقریب تیار ہوگا اور آستانی صاحبہ (ذوق مرحوم کی بیوی) کو بہت تشفی کہلا بھیجی سوائے خلعت معمولی ماتمی کے استانی صاحبہ اور صاحب زادے (شیخ محمد اسماعیل فوق) سے کہلایا کہ کسی طرح کا فرق مواجب معمولی میں ظاہر نہ ہوگا۔“ اس کے علاوہ دہلی اردو اخبار میں یہ بھی درج ہے کہ حضور والا وقار الدولہ محمد اسماعیل (شیخ مرحوم کے اکلوتے بیٹے) کو گلے لگا کر بہت روئے۔

## تاریخہائے وفات

ذوق کے غمِ ممات اور دنیائے شعر وسخن سے رخصت ہو جانے کو شہر شاہجہاں آباد دہلی اور ادبی وشعری حلقوں نے کس طرح محسوس کیا اس کا اندازہ اس کی خبر نگاری اور ان

---

¹ گلستان سخن مرزا قادر بخش صابر: ۲۲۰

قطعات تاریخ سے ہوتا ہے جو مختلف اخبارات کے صفحات میں شائع ہوتے اور جن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے اور بہت دنوں تک ایسی تاریخیں "دہلی اردو اخبار" کے کالموں میں چھپتی رہیں۔ ــــ ایک واقعہ ایسا بھی بیان کیا جاتا ہے جس کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذوق نے اپنی تاریخ وفات کی طرف خود بھی اشارہ کر دیا تھا۔

ایک روز جلسہ میں کچھ ذکر پیش گوئی تواریخ وفات اساتذہ سابقین کا قریب، زمانِ مرض الموت کے ایک شاگرد نے کیا اور رشدہ شدہ اس جلسہ میں رباعی شیخ سعدی شیرازی کسی کی زبان پر گزری آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ اس میں ایک مصرع ہماری تاریخ کی جگہ پر کافی ہوگا۔ اس وقت کسی کو کچھ خیال بھی عدد وغیرہ کا نہ آیا ظاہر ہے کہ عدد جو مصرعۂ اولی رباعی مذکور کے دیکھے جاتے ہیں تو فی الحقیقت ۱۲۷۱ ہیں یعنی مصرع

بلغ العلے بکما لہ

---

اس سلسلہ میں اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا ہے

اب چند روز سے یہ حال تھا کہ اکثر شعری مضامین خصوصاً بعض مطلع و مقطع تو ایسا ہوتا تھا کہ جس سے زمانۂ حال آنکھوں میں پھر جاتا تھا[۱] ایسے کچھ شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

منشی محمد حسین آزاد پرنٹر دہلی اردو اخبار

چو رحلت کرد ابراہیم ذوقؔ از عالمِ فانی
ز گلزارِ جہاں شد سوئے گلزارِ جہاں بلبل
بدل چو فکر کردم بہرِ تاریخِ وفاتِ او
خرد گفتا بگو آزاد رفت از بوستاں بلبل

---

۱۲۷۱

---

۱؎ تتمہ دہلی اردو اخبار: ۱۹ر نومبر ۱۸۵۴ء

اس سلسلہ میں یہ عبارت بھی مولانا محمد حسین آزاد کی اپنی تحریر معلوم ہوتی ہے اور اردو زبان کے اس مشہور و معروف انشا پرداز کی ابتدائی نگارشوں کا نمونہ ہے۔

راقم آثم مثل پدر والد ماجد شفقت فرماتے تھے اور ہمہ وقت ارشاد و ہدایت میں ساعی (کوشش کرنے والے) رہتے تھے۔

مرزا نورالدین شہزادۂ والا قدر نے لکھنؤ سے جو تاریخ دہلی اردو اخبار کو بھیجی تھی اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھا تھا جس کی روشنی میں "دہلی اردو اخبار" نے لکھا

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں بھی تمام شعرا اور اہل فصاحت و بلاغت کو رنج اس جاں گداز سانحہ سے لاحق ہوا ہر ایک نے تاریخ استاد مرحوم کی کہی

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جُدا

---

حضور والا کی ایک تاریخ اس سے پہلے پیش کی جا چکی یہاں ایک اور تاریخ درج کی جاتی ہے۔

اُٹھ جاتے جب زمانہ سے استاد ذوق ہائے
بارِ الم سے پشتِ فلک کیونکہ ہو نہ خم
اس درد و غم سے جو دلِ عالم ہے دانیہ؛
سالِ وفات بھی ہے ظفر وائے درد و غم"

۱۲۷۱

---

قطعہ تاریخ: نجم الدولہ اسداللہ خاں غالب

تاریخ وفات ذوق غالب
با خاطرِ دردمند مایوس
خوں شد دل زانکہ تا نوشتم
" خاقانیِ ہند مُرد افسوس"

---

۱۲۷۱

قطعہ تاریخ وفات، از وقار الدولہ محمد اسماعیل خاں فوق

آفتابِ آسمانِ شاعری
مہر برجِ اوج و عظمت آہ ذوق
کرد از دنیا سوے عقبےٰ سفر،
نیّر اعظم، شدہ تاریخ فوق
۱۲۷۱

مولوی امام بخش صہبائیؔ شہید فرنگ کے بیٹے مولوی کریم الدین سوزؔ نے اس موقع پر ایک یادگار قطعہ تاریخ کہا جس میں مختلف سنین ہجری عیسوی فصلی بکرمی وغیرہ میں تاریخیں نکالی گئی تھیں اور جو کئی سو اشعار پر مشتمل تھا یہ غالباً دنیائے ادب کا طویل ترین قطعہ تاریخ ہے جو ذوق کی وفات پر کہا گیا۔

---

## ذوق مرحوم کے پس ماندگان

ذوق کی وفات کے وقت ان کی زوجہ حیات تھیں اور استانی صاحبہ کہلاتی تھیں، ذوق مرحوم اپنے والد شیخ محمد رمضان کے اکلوتے بیٹے تھے ان کے اور کوئی بھائی تھا نہ بہن ان کے اپنے یہاں بھی ایک ہی ولادت ہوئی اور وہ ان کے اکلوتے بیٹے شیخ محمد اسماعیل تھے جو فوقؔ تخلص کرتے تھے شاہی دربار سے وقار الدولہ کا خطاب تھا اور استاد کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کو خلیفہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا جو اہل سخن کے حلقہ میں ایک عزت والا نام تھا۔

محمد اسماعیل فوقؔ کب پیدا ہوئے یا ذوق مرحوم کی شادی کس سنہ میں ہوئی تھی اس کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا، اسی طرح فوقؔ کی تعلیم و تربیت کے بارہ میں بھی موجودہ معلومات کی روشنی میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

سراج الاخبار نے یکم جنوری ۱۸۴۴ء کے شمارہ میں محمد اسماعیل کی دختر نیک اختر کی شادی سے متعلق یہ خبر شائع کی تھی۔

(ترجمہ) چونکہ وقار الدولہ شیخ محمد اسماعیل خاں بہادر خلف سلطان الشعراء

محمد ابراہیم خاں بہادر (المتخلص بہ ذوق) کی دختر نیک اختر کی شادی کی تقریب بروئے کار ہے اس لیے ظفر الدولہ علی اضغر خاں بہادر کو دو سو روپے کے عطیہ کے لیے شاہی فرمان نے شرف نفاذ بخشا"

جس کے یہ معنی ہیں کہ ذوق کی زندگی ہی میں ان کی وفات سے دس گیارہ برس پہلے ان کی پوتی کی شادی ہو چکی تھی ــــ

محمد اسماعیل فوق کے دو بیٹے بھی تھے ایک کا نام ان کی خاندانی روایت کے مطابق شرف الدین تھا اور دوسرے کا نام نجیب الدین جو اپنی والدہ (زوجہ محمد اسماعیل) کے ساتھ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دوران اپنے والد کے لاپتہ ہونے پر دلی سے فرار اختیار کر کے کسی طرح مالیر کوٹلہ پہنچ گئے تھے۔

شیخ محمد اسماعیل فوق دہلی شہر پر انگریزی قبضہ کے بعد گرفتار ہوئے اور بغاوت کے الزام میں ان کو پھانسی دیدی گئی یا پھر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مالیر کوٹلہ میں زوجہ محمد اسماعیل اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر کس کے پاس پناہ لینے گئی تھی اور اس پناہ دینے والے سے خاندان ذوق کا کیا رشتہ تھا ویسے شرف الدین کی پوتی ہما خانم کے بیان سے راقم الحروف کو یہ معلوم ہوا تھا کہ ذوق کے زمانہ زندگی میں اس خاندان کی رشتہ داریاں گنگوہ شریف ضلع سہارنپور میں تھیں ۱۹۴۷ء سے پہلے ان کے بعض رشتے دار بنت ضلع مظفر نگر میں بھی رہتے تھے اور خود ہما خانم کا قیام ۱۹۵۵ء میں احاطہ تیزاب ریلوے روڈ لاہور میں تھا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذوق یا محمد اسماعیل فوق کے بعد اس خاندان میں علمی اور ادبی ذوق باقی نہ رہا اور رفتہ رفتہ یہ اپنی ادبی شناخت سے محروم ہو گیا۔

شرف الدین نے محکمہ نہر پنجاب میں ملازمت اختیار کی تھی اور ان کے چھوٹے بھائی نجیب الدین برتنوں کی تجارت کرتے تھے۔

## املاک

ذوق اپنے زمانہ کے ایک بڑے شاعر زبان داں اور اہل علم شخص تھے شہر اور ملک کے ادبی و شعری حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی لیکن نہ وہ خاندانی طور پر

خوش حال تھے، اور نہ ذاتی طور پر۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان، محلہ کابلی دروازہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے ذوق بھی ساری عمر اسی معمولی سے مکان میں رہے ایک دو مکان انھوں نے اور بھی خریدے جس کا ذکر اِدھر اُدھر ان کی سوانح کے سلسلہ میں آیا ہے۔

"دہلی اردو اخبار" کا بیان ہے کہ شاہی دربار سے انھیں ایک زنجیر فیل اور ایک گاؤں انعام میں ملا تھا اور بادشاہ نے یہ کہہ کر مزید ان کی عزت افزائی کی تھی کہ صلہ اس قصیدے کا جیسا کہ چاہیئے ادا نہیں ہو سکتا۔

## ذوق اور بہادر شاہ ظفر

ذوق کی شاعرانہ زندگی کا سب سے بڑا محور ان کے شوق شعرگوئی اور کلام وشاعری کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کی ذات اور اس کی شاہانہ شخصیت ہے جس سے ذوق کو بے حد لگاؤ تھا اُن کی استادانہ شہرت میں بھی ظفر سے اُن کے استادانہ تعلق کو بڑا دخل تھا۔

ذوق مغل دربار کے ایک ایسے وفادار شاعر اور استاد سخن تھے کہ انھوں نے جیتے جی پھر کسی اور طرف رُخ نہ کیا۔ کسی دوسرے بادشاہ یا امیر کی شان میں قصیدہ لکھ کر کبھی نہیں بھیجا لکھنؤ اور دکن میں بہت سے ان کے قدرداں موجود تھے مگر انھوں نے کسی دربار کی طرف رُخ نہ کیا۔

اور ایک بار جب بہادر شاہ نے یوں ہی بسبیل تذکرہ اُن سے کہا کہ استاد ہمارے بعد جو تخت نشیں ہوگا آپ اس کے لیے قصیدے کہیں گے تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ حضور والا خیمہ بعد میں گرتا ہے اس کی طنابیں پہلے اکھڑ جاتی ہیں جو جس کا ہوتا ہے وہ اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے۔

اس سے بادشاہ کے ساتھ ان کے جذبۂ وفاداری کا اندازہ ہوتا ہے وہ بادشاہ کی غزلوں پر اصلاح دیتے تھے یہ ان کے لیے ایک بڑے اعزاز کی بات تھی اس کے بارہ میں یہ بھی خیال کیا جاتا رہا ہے کہ وہ بادشاہ کو شعر کہہ کر دیتے تھے مگر یہ بات سرتاسر صحیح نہیں ہے۔ ظفر کی شاعری کا اپنا ایک رنگ ہے جو ذوق سے مختلف ہے

UQAABI

(شاعری)

ذوق کی شاعری انکے ذہنی ماحول کے فکری تربیت شعری مزاج اور فنی معیار کو جاننے کے لیے خود ذوق سے بھی واقفیت ضروری ہے اور ان کے زمانۂ زندگی سے بھی جو بڑی حد تک کلاسیکی شاعری اور وسطی عہد کے ادبی رجحانات کا دور اختتام تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا دور آغاز مغلوں کے عہد زوال اور شہر دہلی کے سیاسی انحطاط کا زمانہ تھا سیاسی انتشار کے ساتھ ذوق کے زمانۂ زندگی سے بیشتر شہر دہلی ایک ادبی اور تہذیبی مرکز کے طور پر برابر ٹوٹتا جا رہا تھا اور لکھنؤ انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی کی تہذیب و شہریت کا ایک حریف بنتا ہوا نظر آتا تھا اس لیے زبان دانی اور ادبی قدر شناسی کے پیمانے بھی دھیرے دھیرے بدلتے جا رہے تھے

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام عمل میں آیا یہاں انگریزوں کی رہنمائی اور نگرانی میں دہلی اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں نے ملکر جو کام کیا اس نے بھی آگے چل کر زبان و ادب کی نئی تشکیل میں ایک خاص کردار ادا کیا اس سے ان کوششوں کو فروغ پانے کا موقع ملا جو منتشر تھیں اور مستشرقین جنکے لیے کوشش کچھ پہلے سے کرتے آرہے تھے۔ یہاں اردو کی لسانی اور ادبی تدریس کے امکانات سامنے آئے۔ لغات و قواعد کی ترتیب عمل میں آئی بعض تذکرے لکھے املا کے قاعدے مرتب ہوئے بعض اہم کتابوں کو ٹائپ کے حروف میں چھاپا گیا۔ لسانیاتی بنیادوں پر بھی کچھ اہم کام ہوا اور اُردو زبان علاقائی اور ملکی جڑوں کو تلاش کیا گیا

---

ادھر دہلی کے مقابلہ میں لکھنؤ نے ریاستی امن و انتظام اور خوشحالی و فارغ البالی کے اعتبار سے تیزی سے ترقی کرنا شروع کر دیا اور دہلی کے ادیب شاعر عالم اور عامی بھی وہاں پہونچنے لگے تو آصف الدولہ اور ان کے جانشینوں کے زمانہ کی فضا میں لکھنؤ کے ان لوگوں کو جو نئی ادبی نسل سے تعلق رکھتے تھے یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ ان کا اپنا ایک شہری وجود اپنی ایک تہذیبی شناخت اور ادبی انفرادیت بھی دھیرے دھیرے قائم ہو رہی ہے۔

شروع میں یہ احساس کچھ لسانی اور ادبی امتیازات پر مبنی تھا جس کے نقوش زیادہ گہرے نہیں تھے۔ میر انشاء اللہ خاں کی معروف کتاب دریائے لطافت کی بعض بحثوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے میر سے منسوب یہ قطعہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جن کو فلک نے تاک کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہاں تو جو کچھ ہے وہ ایک زیرین لہر UNDER CURRENT کے طور پر ہے لیکن میر کا اہل لکھنؤ کے سامنے یہ کہنا کہ میرے کلام کے لیے سند یا قلعۂ معلی کی زبان ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اہل دہلی قلعہ کی زبان اور محاورہ کا احترام کرتے تھے اسے فی الجملہ سند مانتے تھے لیکن ان کے نزدیک زبان کی صحت اور حسن استعمال کا معیار جامع مسجد کی سیڑھیاں اور ان کے آس پاس کا علاقہ تھا جس میں سید واڑہ اور محلہ کابلی دروازہ خاص طور پر شامل تھا اسی محلہ کابلی دروازہ کے کسی گوشہ میں ذوق مرحوم کی پیدائش ہوئی تھی اور یہیں انھوں نے ایک عالی خاندان ۔۔ رئیس کے زیر سایہ ا ۔ پرورش پائی تھی۔

وہ خود ایک غریب باپ کے بیٹے تھے اور ایک ایسے نومسلم خاندان کے چشم و چراغ، جس کے پاس اپنی کوئی علمی ادبی اور تہذیبی روایت نہ تھی وہ ہر طرح کے خارجی سہاروں سے محروم تھے، ذوق مرحوم اپنی ذاتی شخصیت کے اعتبار سے وجیہہ و شکیل نہ تھے بلکہ نسبتاً پستہ قامت اور کم صورت تھے۔ ایسے کسی شخص کو اس عہد کی شہری شخصیت بننے کے لیے بہت غیر معمولی ذاتی صلاحیت کی ضرورت تھی اس کا اظہار اس طرح ممکن تھا کہ وہ زبان دانی، علمی لیاقت اور شعر و شاعری میں امتیاز پیدا کریں۔

طبقہ اشراف میں یہ چیزیں بہت مقبول تھیں، با محاورہ زبان بولنے اور روزمرہ کے صحیح اور فصیح استعمال کو لازمۂ شرافت خیال کیا جاتا تھا جس کا ایک وسیلہ شعر و سخن سے

خصوصی دلچسپی تھی۔

ابتدا سے عمر ہی سے وہ شعر کہنے لگے تھے شروع شروع میں اپنی مکتب نشینی کے زمانہ کے استاد حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لیتے تھے پھر اپنی طبیعت کی جودت اور اپنے فکر کی جدّت کے زیر اثر ان سے غیر مطمئن ہوئے تو شاہ نصیر جیسے استاد سخن کی طرف رجوع کیا جو مشکل بھاری ردیف اور قافیہ کے ساتھ بے تکلف بلکہ بے تحاشہ غزل کہنے میں بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے شہزادۂ ابوظفر کے استاد سخن تھے اور قلعہ کے ماسوا شہر میں بھی بہت سے نوعمر شاعر اس فن میں ان کے شاگرد تھے۔

شاہ نصیر کی شعری شخصیت دہلی کی روایت شعر میں ایک نئی نمود کا پتہ دیتی ہے ان کا تعلق اس شہر کے ایک صوفی خاندان سے تھا، شاہ صدر جہاں کے پوتے اور شاہ غریب اللہ کے بیٹے تھے لیکن اپنے باپ دادا کے درویشانہ مزاج اور فقیرانہ چلن کو خیرباد کہہ کر انھوں نے شعر و شاعری کے ذریعہ دنیا داری سے واسطہ پیدا کیا۔ مال و زر اور جاہ و ثروت سے بے نیازی کا رویہ ان کے یہاں دیکھنے میں نہیں آتا وہ تو بظاہر ان کی طلب میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور شمالی ہند کے دوسرے شہروں کے علاوہ جہاں وہ استادانہ معرکوں اور شاعرانہ مقابلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں مہاراج چندو لال کے بلاوے پر دوبارہ دہلی سے دکن کا سفر اختیار کرتے ہیں اور بالآخر وہیں ان کا انتقال ہوتا ہے ذوقؔ ان کی شاگردی تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کی استادانہ روش اور دہلی کے مشاعروں میں اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا احساس رفتہ رفتہ انھیں اپنے استاد سے دور کر دیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ شاہ نصیر کے مقابلہ میں ان کی علمی واقفیت بھی زیادہ ہے اور شاعرانہ صلاحیت بھی اس لحاظ سے اپنے استاد کے مقابلہ میں ذوقؔ ایک خاص امتیاز رکھتے تھے کہ شروع ہی سے وہ ایک قصیدہ نگار تھے جو شاعرانہ فکر و فن کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی بات تھی۔ انہیں شاہ نصیر کے دہلی سے کچھ وقت کے لئے چلے جانے کے بعد شہزادۂ ولی عہد کی استادی کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا اور انھوں نے مشق سخن اور مطالعہ فن شعر کے ذریعہ علم معانی و بیان کے رمز و کنایہ سے بھی واقفیت بہم پہنچائی تھی غرض کہ ان کے یہاں "اکتساب" کا پیمانہ زیادہ لائق توجہ اور قابل

تعریف تھا۔

دہلی میں شاعرانہ مقابلہ اور استادانہ معرکہ آرائی کی فضا پہلے سے موجود تھی۔ انشا اور عظیم جیسے شاہ نصیر کے پیش رو اسکی بنیاد ڈال چکے تھے لیکن اس زمانے میں ایسے مقابلوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی اور دن بدن بڑھتی جا رہی تھی ذوق کو اسی ادبی ماحول میں جینا اور انھیں معرکوں میں اپنی کامیابی اور شہرت کی راہیں ہموار کرنا تھیں۔

چنانچہ ان کی بہت سی غزلیں اور بعض قصیدے انہیں شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ایسے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر گام پر رکھے ہے وہ ہوشِ نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

افتادگاں کو بے سرو ساماں نہ جانیو
دامانِ خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا

اعجازِ پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
بول اُٹھے منہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوزِ دروں دہی ہے پہ ہوں گے نہ داغ پا

تو باغ میں رکھے ہے جو اے رشکِ باغ پا
پھر آئے واں خزاں تو وہیں ہو وہیں داغ پا

تو کہے غنچہ کہ آس لب پہ دھڑی خوب نہیں
چُپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

سامنے سے مرے ٹلتا نہیں
مغز کھاتا مرا دو چار گھڑی خوب نہیں

فتنہ سرکش ہے جبھی تک کہ تری آنکھوں نے
دستِ مژگاں سے کوئی دھول جڑی خوب نہیں

ابرو پہ اس کے خال ہے کیا زاغِ شوخ چشم
سمجھا ہے اپنی شاخِ نشیمن، ہرن کی شاخ

دکھلائی اس کے سرمۂ دنبالہ دار نے
آنکھوں سے ہم کو نرگسِ ہاروت فن کی شاخ

ایسی ہی کچھ غزلوں میں ذوق کی یہ غزل بھی تھی جس کی زمین "ہمدوشِ نقشِ پا" اور آغوشِ نقشِ پا تھی اور جس میں ذوق نے سودا جیسے بڑے استاد کی غزل پر غزل کہی تھی جسے دیکھ کر شاہ نصیر نے اپنے استادانہ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب تم سودا سے بھی اوپر اُڑنے لگے استاد اور شاگرد کے درمیان یہ کشا کش اس معاصرانہ چشمک ہی کی ایک صورت ہے جس سے اس دور کی ادبی فضا بے حد متاثر تھی۔ اس لیے تجربے کی صحت اور جذبے کی صداقت پر زور دینے کے بجائے فقروں کی برجستگی محاورہ کی درستی اور بندش کی چستی پر زیادہ توجہ مبذول رہتی تھی۔

برسر مشاعرہ زبان و بیان کی کسی بھی کمزوری پر گرفت ہو جانے کی وجہ سے ہر نومشق و نوآموز شاعر اس بات سے ڈرتا تھا کہ وہ مشاعرہ میں کوئی ایسی غزل پڑھ دے جو بے اصلاح ہو۔ بے استاد ہونے کے باعث کسی شاعر کا کلام درجہ اعتبار سے ساقط سمجھا جاتا تھا۔ شاگردوں کے گروہ کے گروہ اپنے اپنے استاد کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کے لیے جاتے تھے۔

لکھنؤ میں تو انشا و مصحفی کے درمیان معرکہ آرائیاں اور جگ ہنسائیاں رہیں دہلی میں کبھی یہ نوبت نہیں آئی لیکن سخن ورانہ معرکے ہوتے رہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں شاعری کا ذوق اور شعر گوئی کا چرچا عام ہوا تو عالم و عامی پیشہ ور دوستکار سبھی شعر کہنے کی طرف مائل ہو گئے بہت سے نام کے شاعر تو اپنے استادوں ہی سے غزلیں کہلوا لیتے تھے اس سے بسیار گوئی اور پرگوئی کا رواج بڑھ گیا۔ اساتذہ لمبی لمبی سیر حاصل غزلیں کہنے لگے ذوق کے یہاں بھی ایسی استادانہ غزلوں کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جن میں نک سک سے درست ردیف و قوافی کی نشست ۔ استادانہ ہے لیکن احساس کی شدت اور جذبے کے فروغ کے اعتبار سے شعر بہت کمزور نظر آتا ہے ۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ اس پر سر دھنتے اور بے اختیار داد دیتے تھے۔ یہ شعر آج بھی محاورے، روزمرّہ اور زبان کے خوبصورت ٹکڑوں کے اعتبار سے لائق توجہ ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ذوق کے یہاں، خواب و

خمار اور رندی و مستی کے مضامین بہر نوع برائے نام ہیں۔ ان کے شعروں میں صناعی کا رجحان تو ہے تو لیکن مصنوعی فکر کی مثالیں ان کے یہاں کم ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جذبے کی ہلکی ہلکی آنچ میں تپ کر کندن بن جاتے ہوئے شعر بھی ان کی غزلوں میں اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔

نہیں جز شمع مجاور میری بالیں مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

فکر و فلسفہ بھی ذوق کے یہاں زبان و محاورہ کے سانچے میں ڈھل کر آتا ہے اور گہرے خیال پر مشتمل اشعار سیدھی سادی زبان میں ادا ہوتے ہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ذوق کے زمانہ تک آتے آتے اردو کی اپنی ایک آزاد اور مستقل حیثیت سامنے آگئی تھی۔ خود میر کے عہد سے یہ بات کہی جانے لگی تھی۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

ریختے کی اہمیت پر یہ زور فارسی کے مقابلے میں تھا یہاں کوئی ہندوستانی زبان مراد نہیں ہے۔ فارسی کی خوش آہنگ اور خوش آئند ترکیبوں سے اس دور کی زبان بھی آراستہ ہے لیکن اب اردو پن اور اس کے بے لاگ لب و لہجہ کی بات بھی ذہنوں میں رچتی بستی جا رہی ہے۔ لکھنؤ کی نوابی شاہی میں بدل گئی تو ہم عصر تہذیبی رویوں ہی میں نہیں، زبان و ادب میں لکھنؤ نے اپنا سکہ چلانا چاہا۔

دہلی کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کی شکست و ریخت کے بعد یہ خواہش ایک وقتی تقاضہ کی سی حیثیت اختیار کر گئی جس کا ردِ عمل اس صورت میں سامنے آیا کہ دہلی کی دیرینہ تہذیب اور ادبی شعور نے دوبارہ سنبھالا اور اپنی انفرادی شناخت کو دوبارہ لکھنؤ سے نہیں ہندوستان کے دوسرے ادبی و تہذیبی شہروں سے منوانے کی ایک گونہ بھرپور کوشش کی۔ اس وقت دہلی میں بقول مولانا حالی "کچھ ایسے صاحبِ کمال جمع ہو گئے کہ جن کے جلسوں کو دیکھ کر اکبری و شاہجہانی عہد کے جلسوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی"۔ شاعری بالخصوص اردو شاعری کے لحاظ سے، ذوق زبان اور محاورہ کے لیے سند و اعتبار کا درجہ رکھتے تھے ان کی زبان کی سادگی و سلاست، نرمی و گھلاوٹ کے اعتبار سے لوگ انھیں میر کی روایت کا نمائندہ خیال کرتے تھے۔

اہل شعر و ادب، زبان کی ترقی اور توسیع میں بھی حصہ لیتے ہیں اور اس کی بقا و تحفظ میں بھی ذوق کی یہی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کا نام اور کلام زبان کی صحت و درستی کے لیے کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے<br>
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق<br>
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

زبان کی شاعری اور لب و لہجہ کے تیکھے پن کی جو مثالیں داغ کے یہاں ملتی ہیں اور زبان کی شاعری کے احکامات کو پرکھنے کا جو انداز ان کی ادبی نظر کے "پینے پن" کا پیدا کردہ ہے اس کی دلچسپ شروعات ذوق ہی کے یہاں ہوتی ہے۔ دہلوی اسکول کی شاعری اور دبستان داغ کے پرکشش نمونے ذوق کے یہاں ملاحظہ ہوں۔

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ<br>
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

ہے کان تیرے زلفِ معنبر لگی ہوئی<br>
رکھے گی نہ یہ بال برابر لگی ہوئی

اے خالِ رُخِ یار تجھے خوب بنانا
جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

---

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تانک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مُقرر لگی ہوئی

یہاں اردو پن کے ساتھ دہلی کے اپنے لب و لہجہ کا ٹھاٹ بھی قابل دید ہے جو ذوق سے داغ کو منتقل ہوا اور داغ نے اُسے ایک اداراتی شکل دے دی۔ دلی سے ذوق کی محبت اور اس کی شہری تہذیب سے دلی کا تعلق اظہار ان کے اس معروف شعر سے ہوتا ہے جس کا دوسرا مصرع تو زبان زد خواص و عوام ہے۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ذوق داغ جیسے شاعر زبان کے ماسوا جن کے لہجہ کا بانکپن ضرب المثل بن گیا آخری مغل بادشاہ سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے بھی استاد تھے اور قلعہ کے بہت لوگ ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے، مولینا محمد حسین آزاد جیسا اردوئے معلیٰ کا میرو اور اردو شاعری کا مورخ بھی ذوق مرحوم کا ہی شاگرد تھا۔ تذکرۂ آب حیات مولینا محمد حسین آزاد ہی کی تصنیف ہے انھوں نے اپنے استاد کا دیوان بھی بڑے انوکھے اور دلچسپ انداز سے ترتیب دیا تھا جس کے بے خود لکھا ہے: "میں حاضر اور خدا ناظر تھا راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے تب یہ مہم انجام کو پہنچی"
آزاد مولوی محمد باقر (شہید فرنگ) کے بیٹے تھے جو ذوق کے بچپن کے ساتھی اور جگری دوست انھیں مولوی محمد باقر نے اردو زبان کا پہلا اخبار 'دہلی اردو اخبار' کے نام سے سنہ ۱۸۳۶ء میں نکالا تھا۔ حافظ غلام رسول ویران، ظہیر دہلوی اور انور دہلوی بھی ذوق مرحوم ہی کے ممتاز شاگردوں میں تھے انھیں تینوں لائق افراد نے مل کر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ذوق کا دیوان مرتب کر کے پہلی بار شائع کرایا تھا۔

**ذوق کی قصیدہ گوئی** ذوق مرحوم نے زبان کی جو خدمت کی اور اس میں حسن بیان اور لطف سخن کے امکانات جس قدر

اور جس انداز سے اجاگر کیا اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے محض زبان محاورے اور روزمرّہ سے وابستہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ان کے قصائد کی فضا علمی اور ادبی ہے اس کا رشتہ صرف شہری زبان اور گلیوں، بازاروں کی بولی سے نہیں ہے۔
میر کا ایک معروف شعر ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

غزل چونکہ مجلسوں اور عمومی مشاعروں کی چیز رہی ہے اس لیے اس طرزِ گفتگو سے عوام کا پہلو نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن قصیدے کے شعر بہرحال خواص پسند ہیں اور ان کا ادبی و تہذیبی رشتہ درباروں اور دیوان خانوں سے ہوتا ہے اور اسی لیے قصیدہ کی شاعری فضا زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتی ہے اس میں تشبیہ و استعارہ کی جدّت اور مضامینِ حال و خیال کی ندرت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن جو باتیں کہی جاتی ہے وہ آئین و دستور کے مطابق ہوتی ہے اسی لیے زبان و بیان پر زیادہ قدرت درکار ہوتی ہے۔

قصیدہ کی ابتدا عربی شاعری سے ہوئی۔ فارسی شاعری صدیوں پھیلی ہوئی روایت میں گہرے طور پر اس کا دخل رہا اور قصیدہ نگاری کے بہترین استاد اور فن شعر کے ماہر اس زبان میں پیدا ہوتے اور فارسی کے علاوہ ترکی، دکنی اور اردو میں بھی یہ صنف بے حد مقبول رہی۔

شمالی ہند میں جہاں تک اردو شعر و ادب کی تاریخ کا تعلق ہے مرزا رفیع سوداؔ کو فن قصیدہ نگاری کا نقاشِ اول قرار دیا گیا ہے سوداؔ کے بعد قصیدہ کے کلاسیکی قدر و معیار کے حوالے سے ذوقؔ اردو کے بہت ہی معزز و ممتاز قصیدہ نگار ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ذوقؔ فن قصیدہ نگاری میں سوداؔ کے خوشہ چیں ہیں لیکن دونوں کے قصیدوں کے تقابلی مطالعہ COMPARATIVE STUDY سے پتہ چلتا ہے کہ ذوق کا اپنا الگ ایک رنگ ہے۔

ذوقؔ کا علمی مطالعہ سودا سے کچھ زیادہ وسیع تھا اس لیے ان کے قصیدوں میں علمی اصطلاحیں اور مختلف فنون کے معلوماتی سلسلے بڑے پروقار انداز سے آتے ہیں ان

سے قابل اعتماد تک واقفیت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ ذوقؔ ان اصطلاحوں کا صحیح استعمال کر جاتے۔ ان کے ابتدائی عہد کے قصیدوں میں بھی فلسفہ، منطق علم طب اور معانی و بیان کی تلمیحات بہت ملتی ہیں۔

اپنے ابتدائی دور کے قصائد میں انھوں نے ایک معرکے کا قصیدہ بھی کہا جس میں اٹھارہ شعر الگ الگ اٹھارہ زبانوں میں کہے گئے تھے جس کا مطلع تھا

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب وایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر ان کو اکبر شاہ ثانی کے دربار سے خاقانی ہند کا خطاب عطا ہوا جو ایک بڑا علمی اعزاز تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقعہ پر انھوں نے جو شاندار قصیدہ پیش کیا اس کی ردیف " نور سحر رنگ شفق" کو قرار دیا اس طرح کی پر پیچ ردیفوں کے ساتھ غزل کہنا بھی مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ قصیدہ کہنا اور شعری و شعوری سطح پر ان تمام لوازمات کے ساتھ جو قصیدہ نگاری کے فن اور اس کے ادبی ماحول کی تقاضا ہوتا ہے۔ ایک اور قصیدہ میں جوان کی آخری عمر کا عظیم کارنامہ ہے۔ اٹھارہ علوم و فنون کی اصطلاحیں ان کی شعر و شاعری کی زینت بنی ہیں اپنی علمی فضا کے اعتبار سے ذوقؔ کا یہ قصیدہ اردو کے بہترین قصیدوں اور مدحیہ نظموں میں سے ہے۔

قصیدہ خطابیہ بھی ہوتا ہے اور تمہیدیہ بھی۔ ہر قصیدہ کے شروع میں مطلع ضروری ہے اور مطلع ہی کی اڑان اور سخن ورانہ بے ساختگی اس کی خوبصورتی اور ادبی دلکشی ہے۔ ذوقؔ کے قصیدوں کے اکثر مطلعے دل آویز و فکر انگیز ہیں۔

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمۂ جائے صریر
ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے تماشا گوہر
اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
حبذا ساقیٔ فرخ رُخ و خورشید جمال
مرحبا مطرب ہاروت فن و زہرہ خصال

غزل میں تو مطلع کے بعد حسن مطلع اور زیب مطلع بھی ہوتا ہے لیکن قصیدہ میں ایک

ہی مطلع ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں حسنِ کلام یا مدح کے سلسلہ کو طول دینے کے لیے دوسرا مطلع بھی شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ ذوق کے یہاں بھی مطلع ثانی اور مطلع ثالث کی مثال مل جاتی ہے اور غزل کے اشعار بھی داخل قصیدہ کیے گئے ہیں لیکن یہ روایت عام نہیں ہے۔

تشبیب ہو یا مدح ندرتِ فکر جدت ادا قوت اختراع اور تنوع مضامین ہی سے اشعار قصیدہ کی زینت بڑھتی ہے اور مبالغہ آرائی کے بغیر تو قصیدہ جیسے اپنے فکری حسن سے محروم رہتا ہے۔ قصیدہ ہی میں بات میں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کیا جاتا ہے ذوق کے یہاں بھی اس نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کی عمدہ مثالیں قریب قریب ہر قصیدہ میں مل جاتی ہیں۔

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ جفا
تہہِ دریا سے بھی جا ڈھونڈ نکالا گوہر
کورِ باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت
کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
وہ بہادر شہِ غازی کہ برنگِ نیساں
روز برساتے ہے، ابرِ کرم اُس کا، گوہر
جشن سے، اس کے ہے اک فیض کا دریا جاری
بہتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا، گوہر
صبحِ اقبال وسعادت کا ستارہ چمکا
اُس کے جو طرۂ دستار کا چمکا، گوہر
شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرصِ عنبر اگر ہے زمین تو گرد، عبیر
کرے نہ ہے والبِ غنچہ درِ ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساطِ ہوا تے چمن سے دور نہیں
کہ وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

ہر ایک خار ہے گل، ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر

ذوق نے مدحیہ اشعار کے لیے مخمس، مربع اور رباعی کے فارم بھی اختیار کیے ہیں۔ جیساکہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے ماسوا کسی بھی دوسرے رئیس یا صاحب دربار کے لیے قصیدہ نہیں لکھا۔

وہ مدح گوئی کے اپنے وقار اور درجۂ اعتبار کے قایل تھے اور اسے حصول زر اور طلبِ دولت کا ذریعہ سمجھ کر انھوں نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔

ان کے قصیدوں میں جو علمی فضا اور ادبی ماحول ملتا ہے وہ صرف روایتی نہیں ہے اس وقت کا دہلی شہر بڑے اہل علم اور اربابِ ادب کا مرکز تھا اور ذوق خود اس کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے ایک معمولی، غریب اور کم حیثیت، خاندان کے ایک فرد کے طور پر اپنے لیے دہلی کے اشرافیت حلقوں میں جگہ بنائی اور دوسرے شہروں میں بھی ایک بڑے زبان داں اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ مومن و غالب جیسے شعراء کے معاصر تھے اور اپنے زمانہ میں ان سے کہیں زیادہ بہتر سمجھے جاتے تھے ان کی شخصیت صحیح معنی میں قلعہ اور شہر کے درمیان قدر مشترک کی سی اہمیت رکھتی تھی۔ اور آج بھی ان کی زبان کو سند مانا جاتا ہے۔

شجرہ

محمد رمضان

ذوق

خلیفہ محمد اسماعیل

شرف الدین (جمعدار محکمۂ نہر) رجب الدین (میوہ فروش)

محمد شریف۔ وحیداً۔ شریفاً۔ صغرا بیگم عبدالصمد (تجارت)

شرف الدین کی اولاد میں صغرا بیگم کے بطن سے محمد یعقوب اور ان کی نسل سے دو لڑکے دوست محمد اور اختر حسن ہوتے۔ دوست محمد کے ہاں تین لڑکیاں ہوئیں جن کے نام یہ ہیں: بسم اللہ، فردوسی اور ہمارالنسار بیگم۔

انھیں ہمارالنسار بیگم سے جن کی عمر اس وقت تقریباً ۶۰ تھی۔ مجھے یہ حالات معلوم ہوتے تھے اور ان سے مجھے ان کے بیٹے محمود الحسن ذوق احاطہ تیزاب سلطان پورہ، لاہور نے ملوایا تھا ان سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے پیشتر اس خاندان کا قدیمی شجرہ ایک صاحب کے پاس تھا جو احمد منزل شاملی روڈ مظفر نگر میں رہتے تھے مگر ان لوگوں کے ترکِ وطن سے یہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا اور وہ صاحب وفات پا گئے۔

## املاک

ذوق کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے اور نواب لطف علی صاحب کی سرکار میں مرزا آغا حیدر (حیدرآباد) کے بیان کے مطابق ابتداً دربان تھے۔ مگر نواب صاحب نے آگے چل کر ان کی قابلیت اور نکوکاری کی وجہ سے انھیں اپنا کارندہ بنا دیا تھا۔ وہ کابلی دروازے کے پاس ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے

تھے۔ ذوق بھی تمام عمر اسی مکان میں رہے لیکن دو ایک اور مکان بھی ان کی ملکیت میں تھے۔ ایک مکان کے سلسلے میں مولینا آزاد نے لکھا ہے :

"فرمایا عالم شباب تھا۔ ایک مکان ہمسائے میں بکنے لگا ہم نے لے لیا بعض اشخاص حارج تھے۔ انھوں نے نالش کر دی۔ مولوی فضل حق عدالت میں سر رشتہ دار تھے۔ بڑے بااختیار تھے۔[1]"

"دہلی اردو اخبار" کے بیان کے مطابق :

"آخری عمر میں انھیں بادشاہ کی جانب سے ایک زنجیر فیل مع حوضۂ نقرئی اور ایک گاؤں بھی بطور التمغا نسلاً بعد نسل جاگیر میں مرحمت ہوا۔ اس گاؤں کے متعلق ان کے اہل خاندان کی روایت کا ذکر اس سے پیشتر کر دیا گیا ہے۔[2]"

## ملازم

ذوق کے صرف ایک خاندانی ملازم محمد بخش کا ذکر آتا ہے جو بوڑھا بھی تھا اور مسخرا بھی۔ باورچی خانے میں سب کا اتالیق بنا بیٹھا رہتا تھا اور استاد مرحوم اور ان کے والد کی خدمتیں کرتے کرتے بہ قول مولانا آزاد ایک رقم ہو گیا تھا۔ . . .

"اسے پرانے استادوں کے بہت شعر یاد تھے۔ مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے . . .[3]"

## شخصیت

کسی فنکار کی شخصیت و شعور کو بنانے اور اس کے فن میں اس شخصیت و شعور کے اثرات اور اسلوب اظہار کو متعین کرنے میں توارث، فطری صلاحیتیں

---

۱ دیوان ذوق، مرتبہ مولینا آزاد، ص ۱۴۱

۲ تتمہ دہلی اردو اخبار، ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲ صفر المظفر ۱۲۷۱ھ

۳ دیوان ذوق، مرتبہ آزاد، ص ۱۰۳

ماحول اور تعلیم و تربیت نمایاں طور پر حصہ لیتے ہیں ؛ بلکہ جسمانی ساخت اور صحت و صورت کو بھی اس کی ذہنی ہیئت کے بنانے اور بگاڑنے میں بہت کچھ دخل رہتا ہے، اس اعتبار سے ذوق کی شخصیت کافی دلچسپ ہے۔

ذوق جو شاعرانہ شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے اپنے دور کی بہت ممتاز شخصیت تھے، اپنے ظاہری خدوخال اور قدوقامت کے اعتبار سے بہت معمولی انسان نظر آتے تھے۔ مولینا آزاد لکھتے ہیں :-

"شیخ مرحوم قدوقامت میں متوسط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمّت یہ نہ ہوتے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا، چیچک کے داغ بہت تھے مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوتے تھے کہ چمکتے تھے اور کھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا اور بدن میں پھُرتی پائی جاتی تھی، بہت جلد چلتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیند تھی، جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اٹھتی تھی، ان کے پڑھنے کی طرز ان کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زوردار بنا دیتی تھی۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے، کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ ان کو زیب دیتے تھے!"[1]

"صفائی پسند انتہا درجے کے تھے اور لباس ہر وقت سفید رکھتے تھے۔ کپڑے میں مٹی یا ذرا کسی شے کا داغ لگا اور انھوں نے بدلا۔ حُقّہ پینے کی سخت عادت تھی کسی وقت منہ سے حقہ الگ نہیں ہوتا تھا۔"[2]

ایک تنگ و تاریک گھر تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھی تھی، دونوں طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے، لکھتے جاتے تھے یا کتاب دیکھتے

---

۱ آبِ حیات ص ۴۷۳

۲ آبِ حیات

جاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے بیٹھے گزر جاتی تھیں۔"[1]
ذوق کی زندگی کی اس تصویر میں ہم ان کے ذہن کے اس نقوش کو بھی دیکھ سکتے ہیں جسے ان کی فطرت اور ماحول نے مل کر ابھارا اور فن کے پردوں میں چھپا دیا تھا۔
ذوق کی فطرت اور ماحول کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کی بچپن کی زندگی کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہمیں ان کی خاندانی حیثیت بھی اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ ذوق کے والد شیخ محمد رمضان کو عالم نوجوانی میں گھر سے نکلنا پڑا۔ تلاش معاش میں دہلی آئے۔ کچھ دنوں تک سپاہیانہ زندگی بسر کی، بعد ازاں نامساعدت حالات سے مجبور ہوکر نواب لطف علی خاں (یا نواب رضی خاں) کی سرکار میں ملازمت کر لی اور ان کے در دولت کے دربان گئے۔ اس طرح ذوق عالی خاندان لوگوں کے زیر سایہ زندگی گزارنے والے ایک چھوٹے سے غریب کنبے میں پیدا ہوئے۔
انھوں نے خاندانی رؤسا اور نجابت و شرافت کے مالک انسانوں کو دیکھا جب کہ ان کے اپنے خاندان میں نہ ریاست تھی نہ نسلی نجابت جس کے بغیر مشکل ہی سے اس سوسائٹی میں ایک انسان معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ مزید برآں وہ بہت چھوٹے تھے اور ابھی ان کو مکتب میں گئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ان کے زور کی چیچک نکلی اور اس موذی مرض نے ہمیشہ کے لیے ان کے چہرے کو بد شکل کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ایسا بچہ جو ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوا ہو اور قدرتی افتاد کی وجہ سے ظاہری وجاہت سے بھی محروم رہ جائے، وہ اپنے مکتب کے ہم عصروں اور اپنے محلے کے ماحول کے درمیان خود کو کس قدر تنہا محسوس کرتا ہوگا، خاص طور پر اس حالت میں جب کہ قدرت نے اسے احساس دل اور ادراک کی قوتوں سے محروم نہ کیا ہو۔
ان کے بچپن کے واقعات ہمارے سامنے نہیں لیکن جو کچھ بھی ان کے اس زمانۂ زندگی کے بارے میں ہم جانتے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک خاص ادبی صلاحیت اور جودت طبع کے مالک تھے اور فطرتاً بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ اس صورتحال نے انھیں اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس وستیز و آویز کے لیے ان کی ودیعت فطری کو بروئے کار

---

[1] آب حیات

لانے میں مدد دی۔

وہ ایسے تھے جن کے آبا واجداد گم نام ہوتے ہیں یا جو کسی نہ کسی جسمانی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کے اندر کچھ غیر معمولی صلاحیتیں بھی چھپی ہوتی ہیں، وہ اپنی دنیا آپ پیدا کر کے اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ذوق جیسے ذہنی طور پر قوی لیکن جسمانی طور پر نسبتاً کمزور انسان کے لیے صاحب سیف بننا ممکن نہ تھا اور نہ کچھ اس وقت حیات کا ماحول ہی اس کے لیے سازگار تھا، اس لیے وہ قلم کی طرف متوجہ ہوتے اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کا رُخ علم کتاب کی طرف پھیر دیا۔ 'دہلی اُردو اخبار' کے بیان کے مطابق بچپن ہی سے ان کی طبیعت شعر وسخن کی طرف مائل تھی

وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ جب تحصیل علم متداولہ سے فارغ ہوئے اور فارسی وعربی، صرف ونحو، معانی وبیان وبدیع وعروض وقوافی ومنطق وفلسفہ، حکمت وہیئت اور تفسیر وحدیث وغیرہ جمیع علوم ابدان وادیان سے انفراغ کُلّی حاصل کیا تو اس طرف کما ینبغی توجہ دی اور وہ کمال بہم پہنچایا کہ حاجت بیان نہیں۔[1]

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ان کے علم وفضل کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"۔۔۔ تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آتے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے، تفسیر کا ذکر ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر آتے ہیں — جب تقریر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ پھر جو کچھ کہتے تھے اسے کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا — اگرچہ مجھے اس قدر وسعت نظر بہم نظر پہنچانے کا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے حافظے میں اس قدر مضامین محفوظ کیوں کر رہے۔"[2]

ان بیانات کو کسی قدر مبالغہ آمیز تو سمجھا جاتا ہے لیکن واقعے اور واقعیت سے دور کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ ذوق کی علمیت اور فنی واقفیت کو دوسروں

---

[1] ملاحظہ ہو: تتمہ دہلی اردو اخبار، ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

[2] آب حیات، ص ۴۷۴

نے بھی تسلیم کیا ہے اور ان کے مَبلغِ علم کی وسعت کا سب سے بڑا ثبوت خود ان کا کلام اور خصوصًا ان کے قصائد ہیں۔

ذوق کو جس نفسیاتی تاثر اور ذہنی تحریک نے تحصیل علمی کی طرف مائل کیا وہ ان کی خاندانی حالت ہی تھی، شہرِ دہلی کی (اس وقت کی) علمی فضا اور ان کا وہ ماحول بھی تھا جس کے درمیان ان کی ابتدائی ذہنی تربیت ہوئی۔ ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زمانے کے تجربے اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے بہترین سرمایہ تھیں۔ اس قیمتی سرمائے سے ذوق نے بھی اپنے بچپن میں فائدہ اٹھایا ہوگا اور ان زبانی باتوں ہی نے ان کے اندر علم کتابی کی تحصیل اور حصول معلومات کا شوق پیدا کیا ہوگا۔ اس بارے میں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ذوق بچپن میں میر کاظم حسین کے ساتھ رہتے تھے اور میر صاحب نواب رضی خان کے بھانجے تھے، جن کے متعلق صاحب تذکرہ، گلشن بے خار، نے لکھا ہے ـــــ "بدانست مسائلِ اثنا عشری معروف بود" علاوہ ازیں ذوق کو جوان عمری سے شاہ عبدالعزیز سے بڑی عقیدت تھی۔

ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وسیلے سے اس سے پیشتر بھی ان کی خدمت میں جاتے ہوں ان کی اس حاضری کو فیضان علم سے محروم کیوں تصور کیا جائے، مگر صاحبِ علم و معلومات ہونے کے باوصف ذوق نے اپنے زمانے کے ایک عالم کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں پائی۔ ان کی شہرت و بقائے نام کا ذریعہ ان کی شاعری بنی، جس کے لئے ان کے اندر ایک فطری صلاحیت اور آمدِ خداداد تھی۔ اس صلاحیت کو ابھارنے اور نکھارنے، نیز ایک خاص رنگ و آہنگ بخشنے میں وقت کی ضرورتوں اور ماحول کے تقاضوں نے حصّہ لیا۔ اس زمانے میں علما و فضلا سے زیادہ شعرا کی قدر کی جاتی تھی، تمام معاشرہ شوق شعر میں ڈوبا ہوا تھا عالم و عامی، امیر و غریب، پیشہ ور و غیر پیشہ ور کوئی بھی اس چیٹک سے خالی نہ تھا۔ امرا شعرائے وقت کی قدر افزائی و سرپرستی کرتے تھے اور شعر و سخن سے عام شوق و ذوق رکھنے والے طرح طرح سے ان کی خدمتیں اور ناز برداریاں کیا کرتے تھے۔ یہی قدر افزائی و ناز برداری کا شوق اور شہرت و اعزاز کا خیال ان کے ذوق شعرگوئی کے لیے وجہ تحریک بھی بنا

اور اسی نے ان کے اسلوب اظہار اور ان کا فنی نقطۂ نظر متعین کرنے میں خصوصی حصّہ لیا۔ جس مکتب میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوتی وہاں بھی ہر وقت یہی چرچا رہتا تھا۔ ان کے استادِ اوّلین حافظ غلام رسول شوقؔ خود بھی شاعر تھے۔ محلّے کے شوقین نوجوانوں کو اصلاح اور شعر کہہ کر دیا کرتے تھے۔ مشاعروں میں بھی جاتے تھے اور نوعمر ذوقؔ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہیں شاعروں کی شہرت اور مشاعروں کے شور واہ واہ نے ان کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ انھیں شعر کہنا چاہیے۔

انھوں نے مزاروں پر جاکر دعائیں مانگنا شروع کیں کہ "الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے"! اور جب ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور انھوں نے پہلے پہل دو شعر موزوں کیے، ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ نہ جانے کتنے دنوں تک انھیں پڑھتے، دوسروں کو سناتے اور کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتے رہے۔ لیکن اس دور میں شعر کہنے کے لیے فطری صلاحیت سے زیادہ زبان پر قدرت اور علوم شعری پر دسترس ضروری تھی جس کے بغیر کسی شاعر کی شاعری مشاعروں میں پنپ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے ذوقؔ نے علوم شعری پر علوم کو ضروری سمجھا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے:

"فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا۔ خانِ آرزو کی تصنیفات اور ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اسی قسم کی اور کتابیں گویا ان کی زبان پر تھیں مگر مجھے اس کا تعجب نہیں، اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر یاد تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں کیوں کہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں[1]...."

اس تحصیل علم و تکمیل فن شاعری اور لوازماتِ شاعری کے سلسلے میں ذوقؔ کا ذہن شروع شروع میں کس طرح کام کر رہا تھا؟ اس کا کچھ اندازہ ہم مولانا آزادؔ کی اس تحریر سے لگا سکتے ہیں۔

---

[1] آب حیات، ص ۴۷۴۔

"وہ کہتے تھے، اگرچہ شعر سے مجھے بچپن سے عشق ہے مگر ابتدا میں دنیا کی شہرت ونام وری وتفریح طبع نے مختلف کمالوں کے رستے دکھاتے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا ۔ ۔ ۔ ۔ نجوم ورمل کا بھی شوق کیا اس میں دست گاہ پیدا کی ... آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی وہی خوبیٔ قسمت کا سامان بنی !" [1]

دنیا کی شہرت ونام آوری اور تفریح طبع کا خیال جس نے ان کو مختلف کمالوں کے رستے دکھاتے، وہ ان کی شاعری کے رستے پر بہت دور تک ان کی رہنمائی کرتا رہا۔ قلعے کی بزم سخن تک رسائی نے ایک نئے پہلو سے اس میں پختگی اور پائیداری پیدا کر دی اور ان کی شاعری میں فراستی عنصر کو دخل ہو گیا۔ اس سلسلے میں ایک اور بات کی طرف بھی مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ موسیقی میں کمال حاصل کرنے کا خیال انھوں نے اس لیے بھی ترک کیا کہ تکمیل فن کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ 'ڈوم' کہلائیں گے، سپاہی زادہ سے ڈوم بنا کیا ضرور [2]۔ ڈوم کہلانا انھیں اس لئے پسند نہیں کہ سوسائٹی کی نگاہ میں گراوٹ کا احساس ان کے لیے ناقابل برداشت ہے اور اس احساس کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے اپنی علمیت، شاعری اور شہرت کے ذریعے خود کو اس سوسائٹی کا ایک ممتاز فرد بنانے کی کوشش کی۔

اس نفسیاتی کیفیت کو ہم ان کے اور ان کے اساتذہ کے درمیان کشیدگی میں بھی کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ حافظ شوق کو جو کچھ شد بد آتا تھا جب وہ انھوں نے سیکھ لیا تو ان سے غیر مطمئن ہو گئے۔ اس بے اطمینانی کی وجہ یہ تھی کہ حافظ صاحب ایک معمولی شخصیت کے آدمی تھے۔ شاعرانہ اعتبار سے ان کا کوئی مقام نہ تھا اور ان سے شاگردانہ تعلق ذوق کی شاعری اور شہرت کے ارتقا میں کسی طرح مدد ومعاون نہیں بن سکتا تھا۔ شاہ نصیر اس وقت کے اساتذۂ دہلی میں سب سے زیادہ طبّاع ومشّاق تھے اور اس کے ساتھ ان کی شاعری اور شہرت دہلی میں اپنے عروج پر تھی [3]

---

ع[1] آب حیات۔ ص ۴۷۷

ع[2] ایضاً

ع[3] ملاحظہ ہو ترجمۂ نصیر، ریاض الفصحا، ص ۳۳۲

ایسے استاد کی شاگردی ہی ذوق جیسے کسی نوجوان شاعر کے لیے باعث افتخار واشتہار ہوسکتی تھی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب انھیں خاطر میں نہیں لاتے، ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد نہیں دیتے اور ان کے مقابلے میں اپنے صاحبزادہ کو بڑا بنانے کی فکر میں ہیں تو انھوں نے ان سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور آخر شاہ نصیرؔ نے جب ان پر معاصرانہ چوٹیں کیں تو انھوں نے ان کے مقابلے میں غزلیں کہیں تاکہ شاہ نصیرؔ اور ان کے ساتھ اہلِ شہر یہ جان لیں کہ ان کے اندر بھی استادِ شاہ اور استادِ شہر بننے کی صلاحیت ہے۔ صاحب "حیات ذوق" نے لکھا ہے کہ "ان کا جوشِ جوانی اور ان کی ذاتی لیاقت ان کو کسی سے دبنے نہ دیتی تھی[۱]۔"

لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ اس زورِ طبیعت کو کبھی انھوں نے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ ان میں ابھرنے اور اپنے ماحول کو ذہنی طور پر تسخیر کرنے کی ایک خواہش اور شدید خواہش تھی، مگر سرکشانہ جذبات ان میں نہیں تھے۔ بچپن ہی سے ٹھوکر کھا کر سنبھل جانے اور احتیاط برتنے کی ایک طبعی صلاحیت ان کے اندر موجود تھی۔ اس طبعی احتیاط نے ان کو بڑی حد تک اعتدال پسند بنا دیا تھا۔ اس اعتدال پسندی کو ہم ان کی زندگی اور ذہنی کاوش دونوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ زمانے کے ساتھ "ستیز" ہی کے نہیں 'بساز' کے بھی قائل تھے۔

یہ میلان اس سوسائٹی کے اثر کا نتیجہ تھا جو اصول پرست واتباع پسند تھی اور وضعداری جس کے خمیر میں داخل تھی۔ اعتدال پسندی رکھ رکھاو اور پاسِ وضع انھوں نے اُس ماحول سے بھی سیکھا تھا جس میں ان کی ابتدائی ذہنی تربیت ہوئی تھی، اور اس فضا سے بھی جس سے بہ حیثیت علم اور فن کے وہ متعلق رہے۔ وہ بہادر شاہ کے متوسل اور شہزادگان قلعہ کے استاد شاعر تھے۔ قلعہ اس عہد کے روایتی تہذیب و تمدن کا نشان تھا اور اس وقت کے شرفا کا مرکزِ توسّل۔ اسی کے ساتھ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ سے بھی ان کے تعلقات رہے۔

---

[۱] حیات ذوق، ص ۱۸۔

ان ہی نے ان کے دل میں قدیم تہذیبی قدروں اور جاگیردارانہ روایات کے لیے ایک جذبہ احترام و وفاداری پیدا کیا۔ اس وفاداری کا تعلق اس نظام فکر سے بھی تھا جس کی علامت بادشاہ کی ذات تھی اور اس شہر سے بھی جس نے ان کے ذہن اور ان کی ذات کو رفتہ رفتہ ایک خاص تہذیبی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ 'دہلی اردو اخبار' کی روایت ہے کہ "حضورِ اقدس سے وہ محبت دلی اور اخلاص قلبی تھا کہ باوجود اور ریاستوں کے، مثل حیدرآباد و لکھنؤ وغیرہ کے، خطوطِ طلب مع امدادِ سفر خرچ آتے۔ چنانچہ راجا چندو لعل مختار ریاست دکن نے مکرر وسہ کرر بازرکثیر طلب کیا اور لکھنؤ سے چند بار خطوط طلب آتے بلکہ فی الحال بھی ایک خط لکھنؤ سے آیا ہوا تھا کہ ابھی تک جواب بھی نہیں لکھا گیا۔ غرض حضور والا کے قدم سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔"[1]

بادشاہ سے محبت اور وفاداری کے جذبے کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ نہ وہ کبھی دلی کی گلیاں چھوڑ کر کہیں گئے، نہ انھوں نے کسی اور کی مدح کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوقؔ میں گو اپنے ماحول کو تسخیر کرنے کے لیے ایک شدید جذبہ یا خواہش موجود تھی مگر اس کے ساتھ وہ درویش خو اور قانع مزاج بھی تھے۔ اپنے کردار کے اس پہلو کو انھوں نے اپنے اس قصیدے میں پیش کیا ہے جو انھوں نے مرزا مغل بیگ کے لیے لکھا تھا۔ اس میں وہ اپنی قناعت پسندی اور درویش خوئی پر زور دیتے ہیں اور صرف اس لیے اضافۂ تنخواہ و منصب کے خواہش مند ہیں کہ دوسروں کی نظر میں وہ اپنے وقار کو باقی رکھ سکیں تاکہ رضا جوئی ہر صورت میں انھیں منظور ہے اور یہ رضا جوئی اس وضع داری، قناعت پسندی اور خاکساری کا ثبوت ہے جو ایشیائی اخلاق کی اہم بالشان صفات ہیں۔ مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے: "سایہ تربیت ظلِ سبحانی میں تب جوانی کو صبح پیری تک پہنچایا اور رضائے مرشد آفاق میں اپنی ہوائے نفسانی کو یک قلم مٹا دیا۔ خسرو روزگار کی بدولت جس قدر درجہ اعتبار کا بلند ہوا

---

[1] تتمہ دہلی اردو اخبار، ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

مرتبہ پندار کا پست اور جتنا دبستان کمال میں ہوشیار رہو امیکدۂ عرفان میں مست رہے۔[1]

جاگیرداری نظام کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کو ہم ان کی بعض اور عادات میں بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ سفید لباس پہنتے ہیں اور اس میں ذرا سا دھبہ نہیں لگنے دیتے۔ اس صفائی پر وہ اپنی زبان و بیان میں زور دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ شعر کہتے وقت زبان کی نوک پلک کا جذبات کی چھوٹ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام 'درست' ہے جو ان کی زندگی، ذہن اور زبان کو پیش کرنے کے لیے ایک ننھا سا مرقع ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ذوق زندگی بھر ایک دربار و جاگیردارانہ نظام سے وابستہ رہے لیکن کہیں بھی انھوں نے اس کے غیر صحت مند رخ کی تائید نہیں کی۔ ان کے یہاں تعیش پسندانہ شاعری برائے نام ہے۔ ان کا عشقیہ جذبہ بھی ایک فطری اور انسانی رنگ لیے ہوتے ہے۔ اس کے ساتھ وہ انسان کا بہت احترام کرتے ہیں اور عوام سے بے حد ہمدردی رکھتے ہیں۔

ان کی اس ہمدردی کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنی دعائے نیم شبی میں اپنے محلے کے حلال خور تک کو فراموش نہیں کرتے اور اس کے بیمار بیل کی صحت کے لیے دعا کرتے ہیں۔[2] اس عوامی ہمدردی اور عوام الناس سے ذہنی اور خاندانی تعلق نے انھیں عوام کی زبان، ان کے محاورات، روزمرہ اور عام اخلاقی قدروں کو اپنی شعر و شاعری میں نمایاں طور پر جگہ دینے کے لیے مجبور کیا۔ عوام سے ذوق کا یہ رشتہ ان کے افکار و کردار کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے۔

---

[1] گلستان سخن، ص ۲۱۸

[2] ملاحظہ ہو 'آب حیات'، ص ۴۸۰۔

انسانوں سے محبت کے علاوہ وہ جانوروں پر بھی بے انتہا شفقت کرتے ہیں۔ انھوں نے عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔ کم آزاری کی یہ کیفیت ہے کہ موذی جانوروں تک کو مارنا گوارا نہیں کرتے۔ صاحب "خاقانی ہند" نے اس رقت قلب کو "جینیت" سے تعبیر کیا ہے اور اسے ان کے نسلی توارث کا نتیجہ کہا ہے۔

ان تاثرات و تصورات کے علاوہ ان کی زندگی اور ذہن پر شروع سے آخر تک جس جذبے کا سب سے زیادہ اثر رہا، وہ ان کا مذہبی جذبہ تھا۔ گو مذہبی موضوعات پر ان کی مستقل نظمیں نہیں ملتیں لیکن ان کے بہت سے اشعار سے ان کے مذہبی تصوّرات اور مذہبی مسائل سے ان کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ عملی طور پر وہ اس سے بھی زیادہ مذہبیت پسند تھے۔ اسی مذہبیت پسندی کے زیر اثر وہ بہت سے مکروہات سے بچے رہے۔ مولٰنا آزاد نے کہا ہے کہ چھتیس برس کی عمر میں تمام مکروہات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی ہے:

"اے ذوق بگو سہ بار توبہ[1]"

مگر مولانا کے خود اپنے بیانات سے ہی یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ جوان العمری میں بھی صوم و صلوٰۃ اور اوراد و ظائف کے پابند تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ اللہ کا نام لینے سے پہلے ایک لوٹا پانی سے کلیاں کرتے رہتے تھے۔ بہت رات گئے تک شب بیداری کرتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے تھے۔ "دہلی اردو اخبار" نے لکھا ہے:

"تواضع اور فروتنی و کسر نفسی اس مرتبے پر تھی کہ اگر اقوال و افعال آپ کے بطور دستور العمل لکھے جاویں تو بجا ہے۔ باوجود اس محنت و مشقّت کے رات اور دن میں دو گھنٹے شاید سوتے تھے ورنہ تمام شب اوراد و ظائف میں گزر جاتی تھی[2]۔"

اس پر مذہبی تنگ نظری و تعصّب ان میں نام کو نہ تھا۔ مولٰنا آزاد کا بیان ہے:

"فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ انھیں ایسا اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ ادب سے یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہیں کرتے تھے، اسی واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا[3]۔"

---

[1] آب حیات، ص ۴۷۱

[2] تتمہ دہلی اردو اخبار، ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

[3] آب حیات، ص ۴۸۵

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ذوقؔ کا مشرب صلح کل تھا۔ وہ عقائد سے زیادہ عملِ خیر اور نیتِ نیک پر زور دیتے تھے اور اس زمانے کے شیعوں اور سنیوں میں اور خود اہل سنت والجماعت کے مختلف گروہوں میں جو اعصابی واعتقادی جنگ جاری تھی اس میں وہ کسی کے طرف دار و جانب دار نہ تھے۔ تاہم اس سلسلے میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ وہ مذہباً شیعی عقائد کے پیرو تھے یا اہل سنت والجماعت کے؟ مولوی کریم الدین نے تذکرہ گلدستہ نازنیناں میں لکھا ہے: "مذہب ان کا شیعہ سننے میں آتا ہے[1]"۔ گارساں دتاسی نے بھی اس روایت کو پیش کیا ہے[2]۔

---

ان معاصر و نیم معاصر شہادتوں کی ایک گونہ تصدیق ذوق کی قلمی بیاض سے بھی ہوتی ہے جس میں ذوقؔ نے کسی غزل کو شروع کرنے سے پہلے 'یا علی مدد'، 'یا علی مدد کن'، 'ہو العلی' وغیرہ لکھا ہے۔ لیکن جہاں ان کی شیعیت کے ثبوت میں یہ روایتیں اور یہ شہادتیں ہمارے سامنے ہیں، وہاں اس کے خلاف بھی کچھ شواہد و قرائن موجود ہیں۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے خود اہل تشیع ہونے کے باوجود اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ کسی اور معاصر تذکرے میں بھی اس کا حوالہ موجود نہیں۔ مولوی عبدالکریم نے گلدستہ نازنیناں کے بعد طبقاتِ شعرائے ہند[3] ترتیب دیا تو ان کی شیعیت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اگرچہ ان کے اشعار سے اہل بیت کی محبت ثابت ہوتی ہے لیکن شیعی عقائد کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے ساتھ اصحاب پیغمبر کا ذکر انھوں نے اعتقاد و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک قصیدے میں جو بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ہے، صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے:

---

ع۱ تذکرہ گلدستہ نازنیناں ص، ۱۱۸

ع۲ تاریخ ادبیات ہندوستانی ص۰۱ ترجمہ ذوق۔

ع۳ حیات ذوق ص۱۳۰

ترا حامی ابوبکر و عمر و عثمان و حیدر ہو

یہ لب و لہجہ کسی شیعہ کا نہیں ہو سکتا۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا بھی یہی بیان ہے کہ ان کا اور ان کے والد کا مذہب اہل سنت والجماعت تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوق آبائی عقیدے کے اعتبار سے سنی تھے لیکن ان کی تربیت ایک شیعی خاندان کے زیر اثر ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں مولانا محمد باقر کی دوستی اور صحبت کے اثرات بھی انھوں نے قبول کیے لیکن شیعی مسلک انھوں نے غالباً کبھی اختیار نہیں کیا۔ ان کے متصوفانہ عقائد جن کے متعلق مولانا آزاد نے لکھا ہے: خصوصاً تصوف میں ایک عالم تھا۔ جب تقریر کرتے تھے یہ معلوم ہوتا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں کہ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین ابن عربیؒ"[1] اور مزارات سے عقیدت بھی ان کے شیعی ہونے سے مانع ہے۔

ذوق اپنی مذہبیت پسندی اور سنجیدہ طبعی کے باوصف زاہد خشک نہ تھے بہ قول صاحب "حیات ذوق" "شیخ ابراہیم اگرچہ متانت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے اور اکثر سنجیدگی اور تھوڑا بولنے کو پسند کرتے تھے مگر ان کی طبیعت مذاق اور ظرافت کی چاشنی سے محروم نہ تھی۔ اکثر اپنے چیدہ چیدہ دوستوں کے ساتھ ظرافت آمیز گفتگو کر لیا کرتے تھے۔"

---

[1] آب حیات ص ۴۷۶

# تلامذۂ ذوق

ذوق مرحوم نے اردو زبان وادب کی جو خدمت کی، اس کا نہایت اہم حصہ ان کی شعری تخلیقات ہیں، جن پر اس سے پیشتر گفتگو کی جاچکی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی توجہ اور کوشش سے طلاب کمال کا جو ایک وسیع حلقہ تیار کیا اور ان میں زبان وشعر کی خدمت اور فن کی اقدار کا جو احترام پیدا کیا اس کی اہمیت بھی ان کی ادبی وشعری تخلیقات سے کچھ کم نہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حلقے میں آزاد اور داغ، ظفر اور ظہیر جیسے زبان دان، ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ دہلی اردو اخبار نے لکھا ہے :

" .... شہر میں اور ارک سلطانی میں اکثر صاحبوں کو ان مرحوم سے افتخار تلمذ حاصل تھا بلکہ دیار وامصار سے لوگ آن آن کر شاگرد ہوتے تھے۔ بیسیوں غزلیں اصلاح کے واسطے شعرائے لکھنؤ کی آتی تھیں۔ مشاقی وجودت طبعی کا یہ حال تھا کہ کسی شاگرد کی غزل واپس نہ کرتے تھے۔ اکثر اسی وقت تہذیب ودرستی کر دیتے تھے .... ان کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کتنی جلدوں میں مرتب ہو گئے ہیں[1] "

سیر المحتشم نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے :

"ان کی اصلاح سے سیکڑوں شاگردوں کی غزلیات کی تدوین ہوئی۔"[2]

ظاہر ہے کہ ایسا استاذ زمانہ جو ہمہ وقت اپنے شاگردوں کی اصلاح وترتیب

---

[1] تتمہ دہلی اردو اخبار ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

[2] سیر المحتشم، ص ۱۳۸

کی طرف متوجہ رہتا ہو، اس دور شاعری میں اس کے شاگردوں کی تعداد کس قدر ہو گی۔ مگر ان مختصر صفحات میں ان کے تذکرے کی گنجائش نہیں۔ ان کے مخصوص و محبوب شاگردوں کا بھی تفصیلی ذکر نہیں کیا جا سکتا چوں کہ ان کی شاعری اور زندگی پر مختلف پہلوؤں سے بہت سا مواد شائع ہو کر ہمارے پاس آچکا ہے اس لیے یہاں ان کے جستہ جستہ واقعات ہی کی طرف اشارہ کرنا ممکن ہے۔

## مولینا آزاد

مولانا محمد حسین آزاد ذوق کے بہت چہیتے شاگردوں میں سے تھے اور خود بھی اپنے استاد کو بے حد چاہتے تھے۔ چنانچہ ذوق مرحوم کے متعلق بیشتر مواد مولانا ہی کی نگارشات میں ملتا ہے مولانا مرحوم نے ذوق سے اپنے والد[1] کے تعلقات کا ذکر اکثر جگہوں پر کیا ہے خود مولانا محمد حسین آزاد کا تاریخی نام "ظہور اقبال" ذوق نے رکھا تھا اور جب بڑے ہوتے تو ان کی تعلیم و تربیت بھی ذوق ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ مولانا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "مجھے اس بیس برس تک اس طرح حضوری رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا[2]"

---

[1] آزاد کے والد مولانا محمد باقر جو مولانا محمد اکبر کے بیٹے تھے مشہور "دہلی اردو اخبار" کے مالک و مدیر ہونے کی حیثیت سے زبان اردو کی تاریخ میں شہرت دوام رکھتے ہیں مولانا محمد باقر شیعہ مذہب کے پیرو تھے لیکن بے انتہا وسیع النظر اور پاک طینت انسان تھے آپ نے صرف کثیر سے ایک امام باڑہ بہ نیت وقف تعمیر کروایا تھا جس کی تاریخ ذوق مرحوم نے "تعزیت گاہ امام دارین" سے نکالی تھی اس امام باڑے میں جو مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں ان میں تبرے کی اجازت نہ تھی۔ مولانا کے اس نقطہ نظر سے بہت سے شیعی علما نے اختلاف کیا ان کے سرگروہ مولانا ہی کے ایک شاگرد مولانا جعفر تھے جنھوں نے مولانا کے خلاف فتویٰ بھی دیا تھا۔ اس جنگ عقائد میں ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا محمد باقر کے مخالفوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے وہ بچ گئے (اگلے صفحہ پر)

مولانا آزاد بھی مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد کی طرح قدیم دہلی کالج کے طالبعلم رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا جعفر سے جو اس وقت دہلی کالج میں اثناعشری شعبۂ دینیات کے صدر تھے۔ تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے مولانا آزاد کو اثناعشری کی جماعت سے الگ کر دیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ وہ سنی فقہ کی جماعت میں شامل ہوا کریں۔ فقہ سنی کے پروفیسر دہلی کے مشہور عالم سید محمد صاحب تھے۔ چنانچہ مولانا محمد حسین نے سنّی دینیات کی تکمیل مولانا سیّد محمّد صاحب کی سرپرستی میں کی۔

آغا باقر نے ذوق اور آزاد کے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"... مولانا محمد باقر اگرچہ مجتہد تھے لیکن ان کی افتادِ طبع نہایت شاعرانہ واقع ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش مزاج اور متین شخص تھے اور اپنے پہلو میں ایک غیر متعصب دل رکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابراہیم ذوقؔ سے انھیں بڑی ارادت تھی۔ اپنے لڑکے محمد حسین کو بچپن سے ہی ذوقؔ کے سپرد کر دیا۔ استاد (ذوق) نے محمد حسین کو آزاد کا تخلص دیا۔ آزاد تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد استاد کی خدمت میں حاضر رہتے۔ وہ بھی جہاں کہیں جاتے آزاد کو اپنے ساتھ لے جاتے چنانچہ اس زمانے کے مشاعروں اور جلسوں میں ان کے ساتھ یہ بھی رہتے۔ استاد ذوقؔ آزادؔ کے حال پر کمال شفقت فرماتے اور اپنے علم و فضل کے خزانے بے دریغ اپنے چہیتے شاگرد کو عطا کرتے ..... آزاد کو اپنے استاد کا بیشتر کلام زبانی یاد تھا۔ غرض اس مصدرِ فیوض کے فیض سے آزاد کی قابلیت اور

---

(پچھلے صفحہ کا بقیہ)

اور یہ مقدمہ کافی دنوں تک چلتا رہا مگر مولانا محمد باقر جو اپنی جگہ ایک راسخ العقیدہ انسان تھے اپنی بات پر اڑے رہے۔ شیعہ اور سنّی علماء سے ان کے برابر کے تعلقات تھے اور ان کے امام باڑے سے مطبخ سے جو کھانا تقسیم ہوتا تھا اس میں شیعہ سنی کی کوئی قید نہ تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مولانا محمد حسین آزاد" از آغا محمد باقر (نبیرۂ آزاد) اورنٹیل کالج میگزین، مارچ ۱۹۳۹ء

لہ آب حیات، ص ۴۴۹

اور طبیعت نے غیر فانی روشنی حاصل کی لے،،

مولانا محمد حسین آزاد جدید اردو شاعری کے بانی مبانی ہیں لیکن یہاں ان کے ایک قصیدے کے ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جہاں انھوں نے بطور تعلّی اپنی تعریف کے بجائے اپنے استاد کی تعریف و توصیف کی ہے :

زبسکہ عالم طفلی سے تا زمانۂ حال
ہمیشہ خدمت استاد میں تھا میں محزوں
وہ کون یعنی کہ استادِ کُل بکلِّ اُمور
خدائے ملک سخن ماہر علوم و فنوں
وہ ذوقؔ جس کا ہے ثانی جہاں میں ناممکن
بزیر گنبدِ گردوں و چرخ نیلی گوں
کہ جس کے قلزم ذخارِ علم کے آگے
ہے قطرۂ حکمت لقمان و علم افلاطون
قلم وہ بحر معانی لہ اک شگاف اس کا
رکھے ہے زیر بغل دونوں جیحون و سیحون
چراغ مہر اگر لے کے ڈھونڈیں زیر فلک
نہ ایسا صاحب جوہر ملے تہہِ گردوں

# داغ

ذوق کے دوسرے چہیتے شاگرد جو دنیائے شاعری میں شہرت عام رکھتے ہیں داغ ہیں۔ داغ بھی اپنے استاد ذوقؔ کی طرح استاد سلطان تھے اور دربار دکن سے انھیں "فصیح الملک" کا خطاب ملا تھا جو "خاقانیٔ ہند" کے مشہور خطاب کی یاد دلاتا ہے داغ کی شاعرانہ شہرت صرف استادِ سلطان ہونے کی وجہ سے نہ تھی۔ اپنے استاد کی طرح داغ بھی زبان و بیان کے ماہر تھے اور یہ ان کی زبان دانی اور استادانہ قدرت

---

لے مولانا محمد حسین آزاد،، اورینٹل کالج میگزین، مارچ ۱۹۳۹ء

بیان تھی جس نے اقبال جیسے شاعر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ذوقؔ کی تربیت نے آزادؔ جیسا جدید شاعر پیدا کیا، اسی طرح ان کے شاگرد رشید داغ نے اقبال جیسے جدید تر شاعر کی شاعرانہ تربیت میں حصّہ لیا۔ اسی کے ساتھ داغؔ کا ایک وسیع تر حلقہ شاگرداں تھا جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اور جس سے وابستہ شعرا اردو زبان و شعر کے اساتذہ اور ماہرین فن میں شمار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت سائل دہلوی مرحوم، آغا شاعر قزلباش مرحوم، مولانا احسن مارہروی مرحوم، حضرت بے خود دہلوی مرحوم اور حضرت نوح ناروی مرحوم، ناطق گلاوٹھی مرحوم، اور جوش ملسیانی مرحوم جیسے استادِ فن کے نام لے دینا ہی کافی ہے۔

داغ کی شاعری اور زندگی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں مختصراً کچھ ایسے واقعات لکھے جاتے ہیں جو ذوقؔ اور داغؔ کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں اور مولانا احسن مارہروی مرحوم کی ڈائری میں مذکور ہیں:

"۔۔۔۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ سب سے پہلے فتح الملک بہادر مرزا فخرو کا میں شاگرد ہوا۔ دو چار غزلیں انھیں دکھائیں۔ خود ولی عہد نے مجھ سے فرمایا تم حضرت ذوقؔ کے شاگرد ہو جاؤ اور انھوں نے داغ تخلص قرار دیا میں نے حضرت ذوقؔ کی شاگردی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں اختیار کی، جہاں بادشاہ اور فتح الملک بہادر نے میری طرف سے حضرت ذوق کی خدمت میں ایک دوشالہ اور چند اشرفیاں پیش کیں اور استاد نے اس وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اسی روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت در دولت پر حاضر ہوتا، مغرب کے بعد وہاں سے مکان کو واپسی ہوتی۔ بادشاہ کی غزل اور میری غزل خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے، باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا تھا اور استاد اصلاح دیتے جاتے لیکن کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ملاحظہ کر کے اصلاح دیا کرتے تھے۔

ذوق کی توجہ کے قصے داغ بہت سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ بیشتر شاگردوں نے یہ قصے داغ سے سنے اور اکثروں سے میں نے بھی سنا یکم اپریل ۱۹۰۲ء

کے روزنامچے میں ایک واقعہ داغ کی زبان سے نقل ہوا ہے ۔
"آج استاد ذوق کا ذکر رہا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک دن صبح کے وقت خاقانیٔ ہند ذوقؔ مرحوم بیٹھے تھے۔ شاگردان رشید دونوں طرف جمع تھے۔ انگیٹھی روشن تھی۔ استاد نے شاگردوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "مہر تو مشعل نما اک روشنی والوں میں ہے" اس مصرع پر جو مصرع لگاتے یہ مصرع اسی کو دے دیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ مطلع بنے۔ سب شاگرد فکر کرنے لگے۔ میرے دماغ میں فوراً ایک مصرع آگیا۔ میں نے اجازت لے کر عرض کیا:
وہ بھبھوکا ایک ہی آتش کے پرکالوں میں ہے۔"
اسی طرح ..... ایک روزنامچے میں لکھا ہے "مرزا صاحب نے فرمایا۔ استاد ذوقؔ نے تمام عمر میں ایک شعر مجھے دیا تھا اور وہ شعر یہ تھا۔

رکھیے قدم سنبھل کے رہ عشق میں وہی
آگے کبھی جس کو ہو کبھی ٹھوکر لگی ہوئی

یہ شعر استاد نے مجھے دیا مگر ایک مصرع انھوں نے مجھ سے مانگ لیا۔ وہ مصرع یہ تھا:

رکھے گی نہ یہ بال برابر لگی ہوئی"

مرزا صاحب نے فرمایا "اس زمین میں استاد ذوقؔ نے جو غزل فرمائی تھی، اس کا بھی ایک لطیفہ ہے۔ میرا مصرع لے کر وہ شعر بنا چکے تھے، پوری غزل کی فکر تھی۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور فرمایا شعر لکھو۔ میں نے دوات قلم سنبھال کر عرض کیا "ارشاد ہو"، برجستہ فرمایا:

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی
رکھے گی نہ یہ بال برابر لگی ہوئی

برابر فکر میں مستغرق تھے۔ میں نے خیال کیا دوسرے شعر کی فکر میں ہیں۔ کچھ دیر بعد بولے داغ ایک مطلع اور ہو گیا۔ لکھو:

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے اور شعر پر شعر فرما رہے تھے۔ ادھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ منٹ میں استاد اور شاگرد دونوں ہی کی غزلیں مکمل ہوگئیں۔ میں نے عرض کیا میری غزل پر اصلاح فرما دیجئے حکم ہوا سناؤ۔ غزل سنتے رہے اور حسب موقع اصلاح بھی دیتے رہے جب یہ شعر پڑھا

بے شک ہے یہ لگاؤ جو کرتا ہے کچھ گریز
زاہد سے دخت رز ہے مقرر لگی ہوئی

بہت تعریف کی۔ بولے بھئی ہم سے یہ قافیہ چھوٹ گیا اور تم اسے لے اڑے کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے اچھا اس قافیے میں ہماری غزل میں بھی یہ شعر لکھو:

کرتی ہے زیر برقعۂ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

جب میں شعر لکھ چکا تو بولے "کہو تمہارا شعر اچھا رہا یا ہمارا؟" میں عرض کیا "استاد کا شعر بہت روشن ہے"۔

۱۱ر جولائی ۱۸۸۹ء کے روزنامچے میں لکھا ہے۔ آج مرزا صاحب اپنے استاد کے طریقۂ اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے بولے کہ ایک روز میں نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا
اس طرف بھی خرام کرنا تھا

استاد ذوقؔ نے جب مطلع سنا تو جھوم گئے۔ بہت تعریف کی۔ بار بار پڑھوا کر سنا اور فرمایا "داغ یہی کلام تمہیں زندہ رکھے گا"۔ میں نے دوسرا شعر پڑھا:

نہیں اٹھتا ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

اس شعر پر استاد نے فرمایا "اصلاح طلب ہے"۔ پوری غزل میں یہی

شعر ایسا تھا جس پر اصلاح ہونے کا اطلاق ہوا۔ اصلاح دینے ہی والے تھے کہ قلعے سے چوبدار آیا اور استاد ادھر روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز جب حسب معمول سہ پہر کو میں حاضر ہوا تو نہر پر پہنچ کر ٹہلنا شروع کیا۔ ٹہلتے ٹہلتے بولے "کل والی غزل کا وہ کون سا شعر تھا جس میں تم نے سلام قافیہ باندھا تھا"۔ میں نے شعر پڑھا تو ذرا توقف کرنے کے بعد میری پیٹھ پر دو ہتھڑ مارا اور بولے "دیکھو اب شعر ہوا" اور میرے شعر کو یوں اصلاح فرمایا

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

نوٹ: یہ تمام واقعات تمکین کاظمی صاحب کی کتاب 'مرزا داغ' کے مسودے سے نقل کیے گئے ہیں۔ (ت۔ ا۔ ع)

## انورؔ

سید شجاع الدین نام، امراؤ مرزا عرف اور انورؔ تخلص تھا۔ یہ ظہیرؔ کے چھوٹے بھائی اور ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد غالبؔ کی طرف بھی رجوع کیا۔ نہایت طباع، ذہین اور خوش فکر تھے۔ عالم جوانی میں انتقال کیا۔ ان کے ہم عصران کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غدر کے بعد دہلی میں جو مشاعرہ ہوا اور جسے حالیؔ، مجروحؔ، داغؔ اور ظہیرؔ جیسے یادگار زمانہ شعرا نے زینت بخشی، اس میں انورؔ بھی تھے۔

"انورؔ کے کلام میں ذوقؔ کی سلاست، مومنؔ کی نزاکت اور غالبؔ کی بلاغت پائی جاتی ہے۔ طبیعت نہایت دقت پسند اور مضمون خیز واقع ہوئی تھی۔ کلام کی شوخی، خیال کی چلبلاہٹ، فکر کی رسائی، روزمرہ کے اٹوٹ فریفتگان سخن کے دماغ میں عجیب سرور اور عاشق مزاجوں کے دلوں میں غضب کا درد پیدا کرتے تھے جو شعر دیکھو پھڑکتا ہوا، حسن خیال و بلندی مضمون پر نظر ڈالو تو ایک خوش آئند حیرت پیدا ہوتی ہے۔" ان کا یہ شعر تو اردو ادب میں غیر فانی حیثیت رکھتا ہے۔

نہ ہم سمجھے نہ تم آتے کہیں سے
پسینہ پونچھتے اپنی جبیں سے

ذوقؔ کے کلام کی جمع و ترتیب میں انور نے بھی اپنے بھائی ظہیر اور استاد بھائی حافظ ویران کے ساتھ بڑا کام کیا۔ ذوقؔ کے بعد کلام کو جمع کرنے میں انور، ان کے بھائی ظہیر اور حافظ صاحب کو کس قدر کاوش کرنی پڑی۔

## حافظ ویران

ظہیر و انور کے تذکرے میں حافظ ویران کا ذکر آچکا ہے۔ استاد ذوقؔ کے شاگردوں میں جہاں تک محبت و تعلق کا سوال ہے، یہ خاص خواص میں سے تھے۔ استاد سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے سامنے اگر ذرا بھی کوئی استاد کے خلاف لب کشائی کی جرات کرتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ اگرچہ نابینا تھے مگر اس کے بدلے میں خدا نے دل کی آنکھیں روشن کر دی تھیں۔ حافظہ بہت قوی تھا اور شاگردان ذوقؔ میں سب سے زیادہ استاد کا کلام انھیں کو یاد تھا۔ انور نے اپنے دیباچے (دیوان ذوق) میں ان کے متعلق لکھا ہے:

"آفریں ہزار آفریں بر محقق والا ہنر مدقق والا امتیاز باریک نظر، نباض سخن، بینندہ ہر گونہ سقم و صحت فن، صاحب علم و کمال حافظ غلام رسول صاحب المتخلص بہ ویران ارشد تلامذہ حضرت اوستاد کہ چشم ظاہر را از دیدن مرئیات جزئیات ظاہری بر بستہ دیدۂ دل را بہ تماشائے انوار معرفت و مشاہدات علم ..... کشادہ اند وہم دریں نابینائی ظاہری کسب و اکتساب اکثر علوم کردہ اند[1]"

مولانا محمد حسین آزادؔ نے بھی حافظ ویران کی قوت یادداشت کی بڑی تعریف کی ہے اور آب حیات، و دیوان ذوق، سے متعلق بعض باتیں انھیں کے حوالے سے لکھی ہیں۔ حافظ صاحب بھی متوسلین دربار بہادر شاہ میں سے تھے اور قطعات

---

[1] دیباچہ ذوق، مرتبہ ویران، ص ۱۸۰۱۳۔

وقتاً فوقتاً تہنیت پیش کرتے تھے۔ ۱۳۰۵ء میں فوت ہوئے "خاک شدہ خواجہ" تاریخ وفات ہے جو اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرون احاطہ صدر دروازہ سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ کبھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس در سے گزرنے والے

## مذاقؔ بدایونی

مذاق بدایونی بھی ذوق کے شاگردان رشید میں سے تھے، جس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ دیوان کے قلمی نسخے میں کچھ غزلیں مذاق کی اپنی بھی ہیں جو انھیں کے تخلص اور غالباً انھیں کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں۔ ان کا تخلص بھی جو خود ذوق نے اپنے مشابہ قرار دیا تھا، ذوق سے قربت و نسبت کا آئینہ دار ہے۔ صاحب حیات ذوق نے لکھا ہے:

"ان کا پایہ کلام میں اپنے مشہور استاد کے ہم پلہ تھے اور فصاحت و خوبی میں بے نظیر تھے مگر چونکہ مولوی مذاق صاحب کا رجحان تصوف اور درویشی کی طرف ہو گیا تھا، اس واسطے انھوں نے مروجہ مضامین میں غزل سرائی ترک کر دی اور اپنے کلام کو صرف نعت گوئی تک محدود کر دیا ان کی شاعری کا مرتبہ نعت گوئی میں بھی ویسا ہی اعلیٰ رہا جیسا کہ وہ فی الحقیقت تھا اور نعتیہ کلام شمالی ہند میں مشہور ہے۔ اور وہ دیگر شعرا کے نعتیہ کلام سے کہیں بڑھ کر اپنے درجے پر شمار کیا جاتا ہے مولوی صاحب موصوف کی شہرت شاعری سے زیادہ درویشی میں ہے اور بہت خلائق ان کی مرید ہے اور وہ اپنے ملک میں ایک نامی شیخ اور بزرگ ہیں.... شیخ مرحوم کے روبرو مولوی صاحب موصوف بھی مروجہ شاعری سے شوق رکھتے تھے۔ ایک دلچسپ معاملہ وقوع میں آیا۔ شیخ مرحوم کی ایک غزل ہے جو عمدگی میں اپنا جواب نہیں رکھتی

جس کا مطلع یہ ہے:

ہے کان اس کے زلف معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ زبان برابر لگی ہوئی

اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

مولوی مذاق صاحب نے بھی اس پر ایک عدد غزل کہی اور اس کے ایک شعر میں محضر کے مضمون کو یوں پیش کیا:

اللہ رے شوق قتل کہ خود اپنے ہاتھ سے
اپنی ہی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

شیخ مرحوم کے سامنے جب غزل پڑھی گئی اور اس شعر کی نوبت آئی تو شیخ مرحوم نے اس شعر پر وجد کیا اور اٹھ کر مولوی مذاق کو سینے سے لگالیا اور کہا کہ اس ایک شعر کے معارضے میں اپنے سارے کلام کو میں بے لذت خیال کرتا ہوں[1]،،

# ظفرؔ

آج ان کے کلام کی لسانی اور ادبی اہمیت پر موجودہ دور کے ادیبوں کی خصوصی توجہ مبذول ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے ان کے فکر و فن کے بہت سے گوشے اجاگر ہوتے جارہے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی تاریخ ادب کے ساتھ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ طبعاً شعریت پسند تھے اور شعر و شاعری سے اپنی گہری دلچسپی کی وجہ سے اپنے زمانے کے بہترین ادیبوں کی توجہ کا مرکز رہے ان کے دربار کی سیاسی اہمیت برائے نام تھی لیکن اس کی ہمہ گیر ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے زمانے کے تقریباً تمام بڑے ادیب و شاعر ان کے

---

[1] حیات ذوق، ص ۴۴۔

دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ان کی بزم شعر و سخن میں شرکت کرتے تھے۔ لکھنؤ کے مقابلے میں دہلی کا ادبی وقار اور شاعرانہ معیار ظفرہی کے درباری شعراء نے سنبھالا۔ ظفر کی شخصیت اور دربار کا اثر غالب اور مومن تک کی شاعری میں محسوس و معلوم کیا جا سکتا ہے۔ استاد ذوق ایک حد تک ظفرہی کی بدولت دلّی کے استاد شعر بنے۔ ظفر ان کے شاگرد تھے اور بہ حیثیت ان سے انھوں نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ لیکن ذوق کی شاعری اور شعور کے ارتقا میں بھی ان کا اثر کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ان شعری فرمائشوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن کی انجام دہی کے لیے باعث تحریک و تشویق خود ظفر کی ذات تھی۔ ذوق کی شاعری میں مقامی عناصر کی شمولیت ذوقؔ پر ظفر کے اثرات کی آئینہ دار ہے۔ ظفر کو ایسے عمومی موضوعات سے بہت دلچسپی تھی۔ بعض متروکات کا استعمال قلعہ معلیٰ کے زبان اور بہادر شاہ کی عمومی زبان سے دلچسپیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ذوقؔ کی شاعری میں جو خارجی رنگ ملتا ہے اور جسے اصطلاحی طور پر ہم لکھنؤ اسکول سے وابستہ سمجھتے ہیں، یہ روایت بھی ذوقؔ کے یہاں بڑی حد تک ظفر اور قلعۂ معلیٰ کے تعلق کی راہ سے آئی تھی۔ فراق نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھاتے ہیں وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے ہیں۔ اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا۔ وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا"[1]

ایک طرف تو یہ تھا، دوسری طرف ظفر کی کلیات کے بیشتر حصے کی تدوین و تکمیل ذوق کے ہاتھوں ہوئی اور اس سلسلے میں وہ اپنے دیوان کے مقابلے ہمیشہ حضور کے دیوان کو مقدم سمجھتے رہے۔

ظفر کا ایک دیوان مطبع سلطانی دہلی میں چھپا تھا مگر کثرت اغلاط کی وجہ سے

---

[1] اندازے ص ۹۴۔

بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ دہلی اردو اخبار پریس میں دوبارہ چھپا تو اس کے ساتھ یہ عبارت سپردِ قلم کی گئی:

"بہ تصحیح جناب افصح الفصحا ابلغ البلغا خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دامت برکاتہم بہ اہتمام بندۂ خاکسار پنڈت موتی لال پرنٹر و پبلشر مطبع دہلی اردو اخبار مکان مولوی محمد باقر صاحب میں چھپا[۱]"

اس سے بھی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دواوین ظفر کی تصحیف و تصحیح میں ذوق نے بہ حیثیت استاد شاہ کس قدر حصہ لیا ہے۔

---

[۱] دیوان ظفر، مطبوعہ دہلی اردو اخبار، مملوکہ اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد دکن

# مصادر

آب حیات　محمد حسین آزاد　طبع اول　۱۸۸۸ء
دیوان ذوق　〃　〃 دوم　مطبع اسلامیہ لاہور

---

دیوان ذوق　مرتبہ: ویران　طبع اول　مطبع احمدی شاہدرہ دلہالی ۱۲۸۹ھ
نگارستان سخن　〃 ظہیر دہلوی　〃 〃　〃 〃 〃 〃

---

حیات ذوق　احمد حسین لاہوری　طبع اول　مطبع خادم التعلیم ۱۸۹۵

---

بہادر شاہ ظفر　امیر احمد علوی
ظفر نمبر، نگار لکھنؤ　مرتبہ: نیاز فتحپوری　۱۹۳۰

---

خاقانی ہند　مولفہ: رفیق خاور　عالمگیر پریس ۱۹۳۲
انتخاب ذوق و ظفر　علامہ دتاتریہ کیفی　انجمن ترقی اردو
قصائد ذوق　مرتبہ: سر شاہ سلیمان

---

ذوق، سوانح و انتقاد　تنویر احمد علوی　مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳
کلیات ذوق　مرتبہ: تنویر احمد علوی　〃 〃 〃 ۱۹۶۷

---

فائل دہلی اردو اخبار
برائے سنہ ۱۸۴۱-۴۲
مسودات ذوق
تتمہ دہلی اردو اخبار
دبر وفات ذوق

بیاض ہاجر (قلمی)

مخزونہ نیشنل آرٹ نیوز دہلی
ذخیرۂ نوادر آغا محمد باقر (مرحوم) لاہور
منقول از کوہ نور لاہور
برائے نومبر ۱۸۵۴
ذخیرہ نوادر مولینا امداد صابری۔ دہلی
مخزونہ ہردیال لائبریری، دہلی

ذوق اپنے زمانے کی علمی فضا اور کلاسیکی ادبی فکر کی ایک علامت ہیں۔ اس وقت دہلی میں بقول مولانا حالی کچھ ایسے صاحب کمال جمع ہو گئے تھے کہ جن کے جلسوں کو دیکھ کر اکبری و شاہجہانی عہد کے جلسوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ شاعری بالخصوص اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق زبان اور محاورہ کے لیے سند و اعتبار کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کی زبان سادگی و سلاست، نرمی و گھلاوٹ کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ذوق کا نام اور کلام زبان کی صحت اور درستی کے لیے کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔